مجلۃ المحصنات

ISSN 2523-11 11

علمی و تحقیقی رسالہ

شمارہ ۷
ہائر ایجوکیشن کمیشن سے منظور شدہ
دسمبر ۲۰۲۰ء

شعبہ تحقیق
جامعات المحصنات پاکستان

ISSN 2523-1111

مجلۃ المحصنات

علمی و تحقیقی مجلّہ

(اردو۔انگریزی۔عربی)

ہائر ایجوکیشن کمیشن سے منظور شدہ

شمارہ: 7

جولائی تا دسمبر 2020ء

ڈاکٹر عابدہ سلطانہ

مدیرہ

شعبہ تحقیق - جامعات المحصنات پاکستان

مرکزی دفتر جامعات المحصنات: R-8 بلاک 8 عقب گلشن شمیم فیڈرل بی ایریا کراچی

فون: 0331-3340957 | 021-36320794 | 021-363711244

ویب: www.mohsanat.edu.pk | ای میل: almohsanatresearch@gmail.com

https//www.facebook.com//mohsanat1

مجلس ادارت ومشاورت

- مدیرہ: ڈاکٹر عابدہ سلطانہ
- معاون مدیرہ: شائستہ فخری

ادارتی بورڈ:

- ڈاکٹر مولانا ساجد جمیل — شیخ الحدیث-سابق استاد جامعات المحصنات
- ڈاکٹر سہیل شفیق — ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اسلامی تاریخ جامعہ کراچی
- ڈاکٹر جہاں آرا لطفی — اسسٹنٹ پروفیسر شیخ زید اسلامک سینٹر کراچی

بین الاقوامی مشاورتی بورڈ:

- ڈاکٹر انور اللہ — اسلامک دعوۃ سینٹر برونائی دارلسلام
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی — ہیڈ آف عربی ڈیپارٹمنٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انڈیا
- ڈاکٹر مناظر احسن — اسلامک فاؤنڈیشن انگلینڈ
- ڈاکٹر عبدالودود — چیئرمین ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک لرننگ، جاگ ناتھ یونیورسٹی ڈھاکہ
- ڈاکٹر سید کفیل احمد قاسمی — چیئرمین شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انڈیا
- ڈاکٹر پرویز ناظر — یونیورسٹی آف کیمبرج انگلینڈ
- ڈاکٹر توقیر فلاحی — چیئرمین ڈیپارٹمنٹ آف سنّی تھیالوجی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انڈیا
- ڈاکٹر آصف نوید — ڈائریکٹر اسلامک کلچر انسٹیٹیوٹ، جرمنی
- ڈاکٹر مولانا شبیر احمد — پرنسپل آسٹریلین اسکول آف اسلامک انفارمیشن، آسٹریلیا
- ڈاکٹر سید عبدالماجد غوری — سینیئر ریسرچ فیلو، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کالج، ملائیشیا
- ڈاکٹر عالم خان — اسسٹنٹ پروفیسر فیکلٹی آف اصول دین، یونیورسٹی آف ترکی

قومی مشاورتی بورڈ:

- ڈاکٹر دوست محمد — ڈائریکٹر شیخ زید اسلامک سینٹر پشاور
- ڈاکٹر حسام الدین منصوری — سابق ڈین فیکلٹی آف اسلامک لرننگ کراچی یونیورسٹی
- ڈاکٹر عصمت اللہ — چیئرمین شعبہ فقہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی
- ڈاکٹر حافظ محمد ثانی — چیئرمین ڈیپارٹمنٹ قرآن وسنہ، فیڈرل اردو یونیورسٹی کراچی
- ڈاکٹر ثناء اللہ بھٹو — سابق ڈین فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز، سندھ یونیورسٹی
- ڈاکٹر عبید احمد خان — ڈیپارٹمنٹ آف اصول دین، کراچی یونیورسٹی
- ڈاکٹر عبدالحئی ابڑو — ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی، اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد
- ڈاکٹر بشیر احمد رند — چیئرمین ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک کلچر، سندھ یونیورسٹی
- ڈاکٹر مصعب افتخار — اسسٹنٹ پروفیسر ڈیپارٹمنٹ آف شریعہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی
- ارشد احمد بیگ — ڈائریکٹر آرگنائزیشنل ڈیولپمنٹ اینڈ سپورٹ رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی
- پروفیسر ثریا قمر — چیئرپرسن شعبہ اسلامک اسٹڈیز جناح یونیورسٹی برائے خواتین کراچی

مضامین کی اشاعت سے متعلق گزارشات

- مجلۃ المحصنات میں اسلامی ادب وعلوم، تاریخ وتہذیب، تقابل ادیان، فلسفہ، سماجی علوم، سیاسیات ومعاشرت وغیرہ سے متعلق موضوعات پر اردو۔عربی اور انگریزی میں علمی وتحقیقی غیر مطبوعہ مقالات شائع کیے جاتے ہیں۔
- مضمون نگار اپنی تحریر کے دو نسخے A4 سائز کے کاغذ پر صفحہ کے ایک جانب اردو اور عربی کے مضامین ان پیج پر اور انگریزی کے مضامین ایم ایس ورڈ پر کمپوز کر کے ارسال کریں گے۔جبکہ ایک نسخہ بذریعہ ای میل بھیجیں۔
- اپنے مضامین درج ذیل ای میل ایڈریس پر فراہم کریں۔

almohsanatresearch@gmail.com

- تحریر ارسال کرتے ہوئے اپنا مکمل نام، خط وکتابت کا پتہ، فون نمبر، ای میل ایڈریس بھی لازماً درج کریں۔
- تحقیقی مقالہ لکھنے کی صورت میں اس کی ابتداء میں 200 الفاظ پر مشتمل خلاصہ (abstract) HEC کے قواعد کے مطابق انگریزی میں تحریر کیجیے۔
- مقالے کا عنوان اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں درج کیا جائے۔
- مجلۃ المحصنات میں مراجع اور حواشی کے لیے APA طریقہ کار اپنایا جائے۔

☆ عابدہ سلطانہ۔(2019ء)۔''عالمِ اسلام کی جدید تحریکیں''۔رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی۔ص 49-57

- یہ بات پیش نظر رہے کہ مقالہ اس سے پہلے کسی اور مجلّہ یا رسالے میں شائع نہ ہوا ہو۔
- تمام تحریریں ادارے کی طرف سے نامزد کردہ ماہرین کی آراء کے بعد شائع کی جائیں گی۔نیز نا قابل اشاعت تحریروں کی مصنفین کو واپسی ادارے کی ذمہ داری نہیں ہوگی۔
- اشاعت کے لیے قبول کیے جانے والے مقالات میں ادارہ ضروری ادارتی ترمیم وتلخیص کا حق محفوظ رکھتا ہے۔
- ہر مضمون نگار/ مقالہ نگار کو شائع شدہ مجلّہ کی ایک کاپی فراہم کی جائے گی۔
- مضامین ومقالہ نگاروں کی آراء سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

زیر اہتمام: شعبہ تحقیق- جامعات المحصنات پاکستان
قیمت فی شمارہ: -/250 روپے

فہرست مضامین

اداریہ	مدیرہ	07
برصغیر پاک و ہند میں عربی زبان کا ارتقاء ایک مختصر تاریخی جائزہ	ڈاکٹر جہاں آراء لطفی	08
اسلام اور مغرب کے مابین تہذیبی تصادم کی حقیقت۔ مولانا مودودیؒ کے افکار کی روشنی میں۔۔تحقیقی مطالعہ	آسیہ بی بی	41
ماحولیاتی آلودگی اور ہماری ذمہ داریاں سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں	ڈاکٹر حافظ محمد سہیل شفیق	53
ریاست مدینہ اور اسلامی فلاحی مملکت کا تصور تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں ایک جائزہ	حمیرا اسرار	72

عربی مقالہ

المقارنة بين المرأة الغربية والمسلمة دراسة تحليلية	دكتور خليل احمد، دكتور سردار احمد	92

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

محترم اساتذہ کرام اور عزیز طلباء وطالبات، مجلۃ المحصنات کا ساتواں شمارہ الحمدللہ آپ کے لیے حاضر خدمت ہے۔ ایک مختصر ٹیم اور آپ سب کا تعاون اس کاوش میں شریک ہے۔ تحقیق کے سلسلے میں کچھ گزراشات ہیں۔

سورۃ مائدہ کی آیت ۶۷ میں فرمان الٰہی ہے

يَأَيُّهَا لرَّسُولُ بَلِّغ مَآ أُنزِلَ إِلَيکَ مِن رَّبِّک

اے رسول ﷺ جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دیں۔

پھر اہل علم کی ذمہ داری ابوداؤد، ترمذی، کتاب العلم باب کتمان العلم میں یوں بیان کی گئی کہ جس عالم دین یا اسکالر سے کسی علم یا مسئلہ کی وضاحت کے بارے میں استفسار کیا گیا اور اس نے جانتے ہوئے بھی اس سے لوگوں کو آگاہ نہ کیا تو اس کے منہ میں قیامت کے دن آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔ یعنی اگر حالات نئے علوم کی دریافت یا نئی تحقیق آشکار کرنے کا تقاضہ کررہے ہوں اور اہل علم حضرات اپنے مجروں کی آغوش میں تسبیح ومناجات کے بارے میں مصروف ہوں یا کسی مسئلہ پر صارفین کے اعتراضات کا جواب اسلامی اصول کے مطابق نہ دیں تو ان کے لیے وعید ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں تحقیق کے مشن میں اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

آپ سب کے تعاون کی طلبگار

مدیرہ

ڈاکٹر عابدہ سلطانہ

برصغیر پاک و ہند میں عربی زبان کا ارتقاء

ایک مختصر تاریخی جائزہ

☆جہاں آراء لطفی

برصغیر میں عربی زبان کا ارتقاء کیسے ہوا؟ کب ہوا؟ بے شک یہ وہ سوالات ہیں جنکا جواب گو کہ بے حد تفصیلی اور واضح نہیں ملتا البتہ اس حوالے سے جو تاریخی شواہد میسر آتے ہیں وہ اس بات کے ثبوت کے طور پر کافی سمجھے جاتے ہیں کہ اس خطے میں عربی زبان کی پنیری تقریبا دو ہزار سال قبل لگ چکی تھی جب عرب تاجروں اور ہندوستانی تاجروں کے درمیان تجارتی رابطوں کو فروغ ہوا اگر ہندوسند کے باشندے عرب تاجروں سے آشنا تھے تو یقیناً ان کی زبان بھی ان کے لیے اجنبی نہیں ہوگی وہ ایک دوسرے کی زبانوں کے الفاظ ایکدوسرے کی تجارتی اشیاء کے ساتھ اپنے اپنے ملکوں میں منتقل کرتے رہے ہوں گے جیسا کہ ہم جانتے ہیں بہت مسالہ جات خوشبوؤں اور ملبوسات کے نام جو ہندوستان میں عام طور پر مشہور ہیں عربوں میں بھی میں وہی نام تعریب کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں ، ان میں سے کچھ نام قرآن میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔شواہد یہ بتاتے ہیں کہ باہمی رابطے اور بھی قدیم ہو سکتے ہیں لیکن ہم بات کر رہے ہیں تاریخی حوالوں کی جن کے ذریعے واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ عرب و ہند تعلقات ظہور اسلام سے بھی کئی صدیوں پرانے ہیں اور یہ کہ ہندوسند میں عربوں کی آمد کے سلسلے کے ساتھ ساتھ اس خطے میں خاص طور پر سندھ میں موہنجوداڑو اور بھنبھور سے ملنے والی مہریں عربی رسم الخط اور تحریر کا پتہ بھی دیتی ہیں۔اس مقالے میں ہم بات کریں گے کہ برصغیر میں عربی زبان کا ارتقاء کیسے ؟ کیونکر ہوا؟ اور تاریخی حقائق اس بارے میں ہمیں کیا بتاتے ہیں؟ بہت سے محققین نے اس موضوع کی مختلف جہتوں کے اہم حقائق پر سے پردے اٹھائے ہیں اور ٹھوس ثبوت مہیا کیے ہیں ان میں ایک نام ڈاکٹر جمیل احمد کا ہے،

ڈاکٹر، اسسٹنٹ پروفیسر شیخ زید اسلامک سینٹر، کراچی یونیورسٹی

ڈاکٹر جمیل احمد اپنے مقالے "حركة التاليف باللغة العربية" میں لکھتے ہیں۔

'بقى الحكم للعرب فى السند قرنين ونصف قرن فظهرت جاليات العرب وقوى اختلاطهم بالوطنين على مر الزمن ولذلک الاختلاط سهم كبير و رائع فى تمكين اللغة العربية وتشيد لآدابها الاسلامية فى البلادالمفتوحه[۱]

ترجمہ: سندھ میں عربوں کی حکومت ڈھائی سو برس تک رہی سو اس دوران عرب وہاں آباد ہوئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے مقامی لوگوں کے ساتھ رشتے ناطے استوار ہوئے اور اس اختلاط سے مفتوحہ علاقوں میں عربی زبان کے فروغ اور اسلامی تہذیب وتمدن کو رواج پانے میں بہت مدد ملی۔

عربوں کے عہد حکومت میں سندھ اور ملتان نہ صرف پہلے فتح ہوئے بلکہ انتہائی متمدن خوشحال اور ترقی یافتہ شہر بنا دیئے گئے۔ یہ علاقہ جات سیاسی سماجی ثقافتی اور تہذیبی لحاظ سے برصغیر سے الگ ہو کر خلافت اسلامیہ میں شامل ہو چکے تھے سو یہاں سیاسی اقتدار کے استحکام کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب اور اسلامی علوم وفنون کو بھی انتہائی سرعت سے نمایاں مقام حاصل ہوا جس کے نتیجے میں قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، تاریخ شعروادب کے لحاظ سے الرور، منصورہ، دیبل، ملتان، اورقصدار علمی شہر کے طور پر متعارف ہوئے جن کو سرکاری سطح پر پذیرائی حاصل تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں:

''فتح سندھ وملتان کے بعد مسلمانوں کی یہ پیش قدمی انہی علاقوں تک محدود رہی اور تقریباً تین سو سال تک ان کی زبانیں ان کی تہذیب ومعاشرت یہاں کی تہذیب اور زبان کو شدت سے متاثر کرتی رہیں۔ اور خود بھی متاثر ہوتی رہیں۔ سلطان محمود غزنوی کے حملے (92ھ/ ۱۰۰۱ء) سے بہت پہلے ہی مسلمان مغربی ہندوستان میں ایک اہم اور مسلمہ حیثیت اختیار کر چکے تھے اور ان کی تہذیب سکہ رائج الوقت کی حیثیت رکھتی تھی برعظیم کے بقیہ حصے کی حالت یہ تھی کہ وہ چھوٹی چھوٹی راجپوت ریاستوں میں تقسیم تھی، خانہ جنگیاں عام تھیں بدھ مت اور جین مت اس زمین سے اٹھ چکے تھے راجپوتوں نے برہمنوں کی فضلیت کو تسلیم کر لیا تھا اور اس کے عوض میں برہمنوں نے انہیں ہندو مت میں شامل کر لیا تھا۔'' [۲]

ڈاکٹر مسعود خان ماہر لسانیات ہیں اور ہند کی زبانوں پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ لیکن یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ سندھی زبان میں بکثرت عربی کے الفاظ ہیں اور اس کا رسم الخط بھی عربی ہے وہ اردو زبان پر اسی زبان یعنی سندھی کے اثرات کو رد کرتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ،

''(مغربی پنجاب کی زبان) اور سندھی دونوں دوآبہ کی زبانوں سے بالکل مختلف ہیں اس لیے اردو کے آغاز کا سلسلہ ان زبانوں سے نہیں ملایا جا سکتا گو کہ مسلمان اپنی زبانوں کے علاقوں میں داخل ہوئے تھے۔'' [۳]

سندھی کے متعلق ڈاکٹر مسعود حسین خان لکھتے ہیں:

''یہ صوبہ سندھ کی بولی ہے اس کے بولنے والوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لیے اس میں عربی ،فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال کیے جاتے ہیں اس کا رسم الخط بھی عربی ہے،اس کی پانچ بولیاں ہیں،جن میں وسطی علاقہ کی 'بچوں' بولی نے تھوڑی بہت ادبی حیثیت اختیار کر لی ہے۔سندھ کو پرانے زمانے میں براچڈ دیس کہا جاتا تھا اس لیے موجود سندھی کا تعلق براچڈاب بھرنش سے ہے۔[۴]

ڈاکٹر مسعود حسین خان کا کہنا یہ بھی ہے کہ:''اردو زبان کی تشکیل کا دوسرا پہلو یعنی ہندوستانی زبانوں میں فارسی،عربی کی آمیزش کا رجحان کبیر کے زمانے میں اپنے شباب کو پہنچ چکا تھا۔

وہ کبیر کے کلام سے عربی کے الفاظ کو منتخب کر کے بطور ثبوت پیش کرتے ہیں۔اکھلاس (اخلاص) اپھترا (افترا) اکتیار (اختیار) اجو (وضو) کھلک (خلق) تریکت (طریقت)۔[۵]

الاصطخری کا کہنا ہے کہ،

وکان اهل المنصوره والملتان و نواحيها العربية والسندية'' [٦]

ترجمہ:منصورہ ملتان اور اس کے ارد گرد رہنے والے عرب وسندھی دونوں تھے۔

المخد وم محمد جعفر اپنی تالیف میں لکھتے ہیں:

''فی اواخر القرن الاول من الهجرة دخلت أرضنا أرض السند فی خطيره الاسلام فافاض الله عليها ماأفاض من الحرية العقلية وتمتع أهلها من خيراتها ومن العلوم والمعارف فی جوصر ونبغ من ابناء ها من أصبح اعيان العام فی العلوم والفنون ،واماعلوم الدين بالذات فنبغ منهم عدد كبير فی عهود مختلفة من ايام دولة الاسلام ومجد المسلمين ،وأيام قوتهم السياسية واذداد عدد النابعين من ابناء السند وكثر وانشرو افی اكناف دولة الاسلام حاملين اسم السند وتجد عدداً كبيراً من رجال العلم فی

دولة الاسلام من ابناء السند انهم برزوا فی شتی علوم الدین ،والعربیة وشئون اخری ،وحین ذلک کان العالم مصابا فی عدة نواح من الفسق والجهل وسابق ابنا بلادالسند ابنا ء البلاد والشئون الاخری فی نواح الحیاة المختلفه.[۷]

ہندوستان میں عربی کا ارتقا ایک حیرت انگیز عمل ہے کیونکہ ہندی اور عربی زبان میں زمین آسمان کا فرق ہے لیکن اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے آغاز کے ساتھ ہی یہاں عربی زبان کا فروغ عمل میں آتا ہے جس کی بدولت یہاں کے مسلمان عربی زبان میں مہارت حاصل کرتے ہیں لیکن فارسی کے مقابلے میں یہ عمل کافی سست نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر زبید کہتے ہیں:

''ہند میں مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے اور حریف ادبیات کے قومی اثرات بھی ہمیشہ کارفرما ہے اس لئے ہند میں جو عربی ادب تخلیق ہوا وہ یہاں کے فارسی ادب کے مقابلے میں بہت ہی کم تھا لیکن ان تمام جغرافیائی اور سیاسی دشواریوں کے باوجود ہند کے مسلمان عربی کو نظرانداز نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ ان کی مقدس مذہبی کتب اسی زبان میں ہیں اور یہی زبان عربی علوم کے بیش بہا خزانے کی کنجی ہے ہند میں عربی زبان میں تصنیف و تالیف کا آغاز اس زمانے سے قبل ہوا جب اسلامی علوم ان تمام ممالک میں زوال پذیر ہونے لگے جہاں گزشتہ زمانوں میں علم و ادب کے حیرت انگیز شاہکار پیش کئے جا چکے تھے اور عربی ادبیات کے متعدد شعبوں میں اسی حد تک ترقی ہو چکی تھی کہ اس میں مزید اضافے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔[۸]

اہل ہند کے فطری خیال و محسوسات کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو آج بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہاں کے رہنے والے غیر ملکی اثرات کو مجبوراً غیر ارادی یا عارضی طور پر قبول تو کر لیتے ہیں لیکن مستقلاً یا حتمی طور پر قبول کرنے میں تردد کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات سخت ردعمل کا مظاہرہ بھی کر دیتے ہیں چنانچہ عرب سلاطین کے ماتحتوں نے عربی زبان کو قبول بھی کیا اور اس کے عروج کو روکنا بھی ان کے لئے ممکن نہ ہوا چنانچہ عربی زبان نے خوب خوب ترقی کی منزلیں طے کر ڈالیں لیکن جونہی انہیں موقع ملا وہ اپنی زبان کی طرف لوٹنے کی کوششیں کرنے لگے اب مشکل یہ تھی کہ عربی و فارسی ملی ہندی ہی ان کے رابطے کا ذریعہ تھی چنانچہ صرف یہ کیا گیا کہ ان عربی الفاظ کو کم سے کم کرنے کی کوشیں کی جانے لگیں۔

یہ کوششیں ہندوؤں کی جانب سے ہی رہتیں تو زیادہ حیرت کی بات نہ ہوتی کہ مسلمان عربی زبان کو بولنا لکھنا پڑھنا اعزاز سمجھتے تھے اور اس زبان سے فطری قلبی لگاؤ رکھتے تھے۔اس زبان کا حد درجہ احترام کرتے تھے اور فخر کرتے تھے لیکن دکھ

اور حیرت تو اس بات پر ہے کہ اس زبان علمی دینی واسلامی زبان کی بیخ کنی کا اولین سہرا ''اکبر اعظم'' کو جاتا ہے جسے اس کی ایسی ہی اسلام بیزار کوششوں خیالات واحکامات کی وجہ سے مسلمانوں سے بڑھ کر ہندوں کی جانب سے ''اکبر اعظم'' کا درجہ دیا گیا یہاں تک کہ آج بھی اسی کو پوری ہندوستانی تاریخ کا ہیرو قرار دیا جاتا ہے۔

برصیغر پاک وہند میں دین اسلام کی بنیادوں کو سب سے زیادہ نقصان ''اکبر'' نے پہنچایا اس کے دین الٰہی کے طفیل برصغیر میں صدیوں سے قائم دین اسلام اور اسلامی روایات کو سخت نقصان پہنچا۔نماز، روزہ، حج، زکوۃ، حلال وحرام، عید تہوار غرضیکہ دین اسلام کی بنیادی جہتوں کو یکسر تبدیل کر ڈالا۔اس کے ان طور طریقوں سے جہاں دیگر اسلامی علوم کو شدید نقصان پہنچا وہاں عربی زبان کو بھی شدید دھچکا پہنچا غرض یہ کہ اس نے دین اسلام کی بنیادوں کو ہلا ڈالا اور جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

مولانا سید محمد میاں اپنی کتاب ''علمائے ہند کا شاندار ماضی''میں رقم طراز ہیں:

''شرعی ثبوت کے بغیر عید کا اعلان کر دیا جاتا اور لوگوں کے روزے تڑوا دیئے جاتے، عربی پڑھنا اور عربی جاننا عیب قرار پایا اور فقہ وتفسیر اور حدیث کے پڑھنے والے مردود و مطعون گردانے گئے۔اعلان کیا گیا کہ عربی علوم کا پڑھنا پڑھانا ترک کر دیا جائے اور علوم نادرہ یعنی نجوم، حساب، طب وفلسفے کے سوا اور کوئی علم نہ پڑھا جائے۔[۹]

جامع اردو انسائیکلو پیڈیا میں ہے:

''عربی زبان کو کم کرنے کی کوششیں اکبر کے زمانے میں ہوئی''آئین اکبری کے متعلق لکھا ہے کہ''ابوالفیض کے چھوٹے بھائی ابوالفضل علامی نے تین جلدوں میں اکبر نامہ لکھا چوتھی جلد''آئین اکبری'' ہے اس میں عربی الفاظ کم سے کم استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔فارسی محاورے اور نئی اصطلاحات زیادہ استعمال کی ہیں۔[۱۰]

اکبر عربی زبان کو اہمیت دیتا اور اس کی ترویج واشاعت کی کوشش کرتا تو آج عربی زبان اس خطے کی دوسری اہم زبان بن چکی ہوئی اکبر نے اگر عربی زبان کو اہمیت نہ بھی دی ہوتی لیکن اگر وہ اس کے سامنے رکاوٹیں ہی نہ ڈالتا تب بھی یہ زبان خوب ترقی کر لیتی لیکن افسوس تو اسی بات کا ہے کہ اس نے عربی زبان سے جان بوجھ کر دشمنی کی اور اس زبان کو برصغیر سے باہر دھکیلنے کی بھرپور کوششیں کیں۔

''اس حوالے سے ملا عبدالقادر کہتے ہیں ایک دن اس نے مجمع کو مخاطب کر کے اپنی رائے ظاہر کی:

ہندی زبان کی کتابیں جو ہندوستان کے مرتاض و عابد دانشمندوں کے تصانیف ہیں۔ چونکہ یہ سب سہی اور بالکل یقینی علوم پر حاوی ہیں اور اس گروہ (ہندوؤں) کے اعتقادات اور عبادات کا سارا دارومدار انہی کتابوں پر ہے لہذا ہم کیوں نہ ان کتابوں کے ترجمہ ہندی سے فارسی زبان میں اپنے نام سے کرالیں اور یہ غیر مکرر اور تازہ ہوگا۔ان سے دینی اور دنیاوی سعادت اور شوکت وحیثیت بے زوال کے نتائج حاصل ہوں گے اور کثرت مال واولاد کے لیے یہ ذریعہ ہوں گے۔اسی کے بعد دفتر قائم کر دیا گیا۔علماء مقرر ہوئے جو ان کتابوں کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے فارسی زبان میں ان کو منتقل کر رہے تھے۔[۱۱] عربی زبان سے نفرت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اکبر عربی زبان کو سخت ناپسند کرتا تھا اور اس کو مٹانے کے درپے تھا۔علماء ہند کا شاندار ماضی میں ہے:

''علم جس زبان میں بھی ہو اسی کی قدر افزائی قابل اعتراض نہیں اعتراض اس بے اعتدالی اور کج روی پر ہے کہ عربی پڑھنا عربی جاننا عیب قرار دیا گیا، اور فقہ وتفسیر وحدیث کے پڑھنے والے مردود و مطعون ٹھہرائے گئے۔ان کے علوم اور ہو گئے ان کی اولاد نا قابل جو اس ملک میں رہ گئی ہے''پاجی گیری''میں نام پیدا کر رہی ہے''۔[۱۲]

عربی حروف کی درگت:

''ایسے حروف جو عربی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں۔مثلاً۔ث، خ، ع، ص، ض، ط، ظ کو بول چال سے بادشاہ نے خارج کر دیا تھا۔اور اس پر عمل کرنے کی یہ صورت نکالی گئی تھی کہ، عبداللہ کو ابداللہ احدی کو اہدی اور از یں قبیل الفاظ کو بگاڑ کر بولتے تھے اور اچھا سمجھتے تھے''۔[۱۳]

اردو زبان میں عربی زبان کی آمیزش بڑے لطیف انداز میں ہوئی اگر برصغیر میں عربی زبان کے ارتقاء کی بات کی جائے تو مولوی عبدالحق کی رائے کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اردو ذخیرہ الفاظ میں عربی زبان کی کلمات بڑی خاموشی کے ساتھ اور انتہائی روانی سے شامل ہوئے بابائے اردو کہتے ہیں:

''اردو میں مرکبات کا ذخیرہ بے انتہا اور بے بہا ہے۔یہ وہ موضوع ہے جو ایک علیحدہ دفتر چاہتا ہے ان مرکبات کو کئی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔بڑی دو قسموں میں ان کی تقسیم کچھ اس طرح سے ہوگی۔(الف) جس میں دونوں لفظ دیسی ہوں۔(ب) جس میں ایک دیسی اور دوسرا فارسی یا عربی کا ہو......مثال کے طور پر جگت استاد، کفن کھسوٹ، ڈھلمل یقین، ایمان دار دیانت دار وغیرہ بعض مرکب عربی فارسی یا فارسی الفاظ ملا کر بھی بنائے گئے ہیں جو صرف اردو میں استعمال ہوتے ہیں۔جیسے

قبول صورت، خوش دامن وغیرہ، طرح باز۔[۱۴]

اعتصام الدولۃ میرزا کلب حسین خان بہادر مبارز جنگ ناؔدر (متوفی ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء) ایک باکمال شاعر تھے۔ ناسخ لکھنوی کے نہایت عزیز اور قابل فخر شاگردوں میں سے تھے۔ انھوں نے لکھنوی طرز شاعری کو پروان چڑھانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر معزز قیصر کی رائے کے مطابق،

''نادر خود عربی اسلامی علوم میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ نادر کے عربی زبان سے شغف اور دلچسپی کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ وہ شاعر کے لیے عربی کا جاننا ضروری قرار دیتے ہیں۔ تذکرہ شوکت نادری میں جگہ جگہ انھوں نے عربی شاعری سے اپنی واقفیت کا اظہار کیا ہے۔ ان کی فارسی زبان وادب سے گہری وابستگی کا پتہ بھی اسی تذکرے سے چلتا ہے۔[۱۵]

آگے جا کر ڈاکٹر معزز لکھتے ہیں:

''نادر نے عربی و فارسی کے ادق اور نامانوس الفاظ جن کی غزل کسی طرح متحمل نہیں ہے، جا بجا استعمال کیے ہیں مثلاً اعمیٰ وابکم، موید، حصر، مترصد۔ مطول، نشعب، حنوط، حجزہ، انحنا، عتیل، مستحیل، کیلوس، غوامض، اغلال، کدر، عبھر، مدور، معجم، حماد، حلم، مستفیض، ماوجب، تنجیم، عزیمت، معرب، کابوس، مروحہ، حنظل، درجک، لیزم، مدرکہ، عاطل، فصاد، تبرید، دلاك، تحافت، خضر وغیرہ۔[۱۶]

اعمیٰ وابکم کا استعمال دیکھیے کس طرح وہ اپنے شعر میں کرتے ہیں:

گل ونرگس میں کوئی حسن کی کس کو خوش آتی ہے
نہیں شیدا دل اپنا خلق میں اعمیٰ وابکم کا [۱۷]

اردو زبان میں عربی زبان کے تصرف کی کچھ اور مثالیں بھی بڑی حیرت انگیز ہیں۔ جنہیں صرف ہندوستان بھی میں فروغ ہوا اس کی مثال بھی برجموہن داس کیفیہ نے دی ہیں کہتے ہیں۔

''عربی کا ٹکڑا تھالا الی الذین ولا الی الذین ''اس کو اردو میں اللذی واللذی کر دیا (یعنی پہلے میں الف زیر اور دوسرے میں الف پر پیش) جس کا مطلب ہے مذبذب یعنی ڈانوڈول۔[۱۸]

ریل کے لیے ہندوستان میں ایک فاضل مصنف نے ''سکۃ الحدید'' وضع کیا مگر زبان نے اس کو قبول نہ کیا۔[۱۹]

سکۃ الحدید جیسا کہ ہم جانتے ہیں عربی زبان میں ریلوے کے لئے استعمال ہوتا ہے جب کہ ریل کے لیے لفظ قطار استعمال ہوتا ہے۔ برصغیر میں عربی زبان کو مسلمانوں نے پروان چڑھایا ہندو اس میں جزوی طور پر شامل رہے لیکن کلی طور پر شامل نہ ہو سکے کیونکہ بہت سے کلمات یا الفاظ مسلمانوں کے لئے قرآن کریم کی تلاوت کرنے اور سیکھنے کے باعث نیز نماز و اذکار کی ادائیگی کے باعث زبان پر رواں تھے اور مسلمان ان سے بخوبی آشنا تھے چنانچہ اپنی گفتگو میں استعمال کرنا کوئی انہونی بات نہ تھا اور فطری طور پر یہ بات ہندوؤں کے لیے ممکن نہ تھی چنانچہ اس کا گلہ بھی نہیں ہونا چاہیے البتہ بہت سی ہندو شخصیات روزمرہ کی بول چال میں بسم اللہ، الحمدللہ، ماشااللہ اور سبحان اللہ بولتی تھیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

برجموھن داس اس کی ایک اور مثال ہوائی جہاز کی دیتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

''پچھلی صدی کے اواخر میں جب انسان پرواز پر قادر ہوا تو عربی زبان کے اتباع میں اس کی ہوائی سواری کو ''طیارہ'' کیا گیا۔ مگر اب اسے ہوائی جہاز کہتے ہیں۔[۲۰]

ذرا سا غور کیا جائے تو ''طیارہ'' اور ہوائی جہاز دونوں الفاظ میں عربی زبان کا عمل دخل پایا جاتا ہے۔ طیارہ تو ہے ہی طار سے جس کا مطلب اڑنا ہے جب کہ عربی میں اس سے ''طائرہ'' بنایا گیا ہے طیارہ نہیں اور ''طیارہ'' اسے فارسی میں کہا گیا ہے۔ وہاں سے اردو میں آیا جہاں تک ہوائی جہاز کا تعلق ہے تو ہوائی فارسی کا لفظ ہے 'ہوا سے اور جہاز عربی کا لفظ ہے ''جھز سے جس کا مطلب مشین یا آلہ ہوتا ہے۔ اردو کے مرکبات پر غور کرنے سے یا ضرب المثال کو کھوجنے سے بڑے بڑے دلچسپ حقائق عیاں ہوتے ہیں ہمیں یہاں چونکہ اپنے موضوع پر بات کرنی ہے اس لیے یہاں ان کا ذکر بے محل ہوگا۔ البتہ چند مثالیں کچھ ایسے متعلقات کی ضرور دینا چاہیں گے کہ جس کا ہماری روزمرہ کی بول چال سے بڑا گہرا تعلق ہے اور ہمیں اس کا اندازہ کرنا ضروری ہے کہ یہ عربی زبان کی روزمرہ بول چال ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

عربی کے متعلقات عام طور پر ہمارے ہاں استعمال ہوتے چلے آرہے اور ہماری زبانوں پر رواں دواں ہیں اس بات پر کم ہی غور کیا جاتا ہے کہ عربی کے عام بول چال میں بولے جانے والے یہ متعلقات وکلمات ہماری زبان میں بالکل رچ بس چکے ہیں مثلاً کیفیہ میں دی ہوئی فہرست ملاحظہ ہو:

۱۔فی زمانہ	۲۔نسلاً بعد نسل	۳۔قریب المرگ	۴۔دائم المریض
۵۔فی الحال	۶۔بالفعل	۷۔علی الرغم	۸۔بالعکس

۹۔تنازع للبقاء ۱۰۔بعینہ ۱۱۔بین بین ۱۲۔فیما بین

۱۳۔فی الواقعی ۱۴۔فی الواقع ۱۵۔وغیرہ ھم ۱۶۔وغیرہ[۲۱]

انشاء کے اعتبار سے عربی فارسی میں تصرف بھی ہوتا رہا ہے جیسا کہ شب برأت کو شبرات اور عید الاضحیٰ کو بقرعید کہا جاتا ہے۔[۲۲]

''زبان عربی دنیا کی وہ واحد زبان ہے کہ جس میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ کسی مادہ میں جس قدر بھی تغیرات اور اشتقاقات ہوتے ہیں ان میں تغیرات کی بناء پر اگر چہ ظاہری مفہوم میں کچھ کچھ تبدیلی ہوتی نظر آتی ہے مگر مادہ اصل میں جو مفہوم اور معانی پائے جاتے ہیں ہمیشہ برقرار رہتے ہیں اور مشتقات میں قواعد وضوابط کے تحت ظاہری تبدیلی آتی رہتی ہے کہ مادہ اصل میں فلاں حروف بڑھانے سے مفہوم میں اضافہ ہوگا۔فلاں باب میں جانے سے معنی میں یہ تبدیلی رونما ہوگی لیکن مادہ اصل میں جو مفہوم پایا جاتا ہے وہ اپنی جگہ کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہتا ہے۔[۲۳]

مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی (۱۹نومبر۱۶۹۲ء تا ۱۱فروری۱۷۶۱ء) کا نام برصغیر کے ان علماء کی فہرست میں ایک نمایاں نام ہے جو عرب میں بھی اپنی نمایاں شناخت رکھتے ہیں آپ کی شخصیت سندھ کے علمی افق پر ایک درخشاں ستارے کی مانند ہے آپ ایک محدث،مفسر،فقیہ،سیرت نگار اور قادرالکلام شاعر بھی تھے۔

آپ کی تالیفات عربی فارسی اور سندھی تینوں زبانوں میں ہیں جن کی تعداد تین سو لگ بھگ بتائی جاتی ہے آپ کو کلہوڑا دور کے حاکم غلام شاہ کلہوڑا نے ٹھٹہ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ ان کی تصنیفات کے مخطوطات پاکستان کے علاوہ بھارت،سعودی عرب،ترکی اور یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں ۔

''مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی کا قیام ایسے خوش نصیب مرکز میں تھا جہاں کی درسگاہوں کا مقام آج کی یونیورسٹیوں سے کسی قدر بھی کم نہ تھا اور جہاں شب بھر میں ہزاروں صفحات کی کتب نقل ہو جاتی تھیں۔آپ کے پاس ایک زبردست کتب خانہ تھا۔اسلامی دنیا میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو اس عظیم الشان تاریخ کتب خانے میں موجود نہ ہو۔'' [۲۴]

علامہ محمد ہاشم ٹھٹھوی کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے اسی کتب خانے کی بدولت ہی مذہبی شرعی مسائل کے علاوہ تاریخ وسیرت پر خوب قلم آزمائی کی سندھی کے علاوہ آپ کے علمی آثار کا ترجمہ عربی اور فارسی زبانوں میں بھی ہے۔ مخدوم صاحب کی عربی کتب جامعہ ازہر(قاہرہ) میں اب بھی پڑھائی جاتی ہیں۔[۲۵]

ڈاکٹر زبید کہتے ہیں کہ ''برعظم پاک وہند میں عربی کبھی بولی جانے والی زبان نہیں بنی۔اس لئے یہاں عربی میں زیادہ تر حواشی اور شروح لکھے گئے تا کہ طلباء عربی کی نصابی کتابوں کو پوری طرح سمجھ سکیں۔ چنانچہ یہاں کتابوں جو ذیلی نوٹ اور حاشیے لکھے گئے، وہ بہت مفید ثابت ہوئے اور ان سے بہت مدد ملی۔[۲۶]

اس طرح قرآن کریم کے اشاریے تیار کئے گئے دراصل غیر عرب اقوام میں قرآن کریم ہی عربی زبان سے دلچسپی اور کشش کا محور بنا جس نے امت مسلمہ کے مختلف زبانیں بولنے والوں کو ایک لڑی میں پرو دیا چنانچہ عربی کے علاوہ کسی بھی زبان کا بولنے والا نماز ایک ہی زبان میں پڑھتا ہے اور قرآن کی تلاوت اس کی نزولی زبان ''لسان عربی''میں ہی کرتا ہے چنانچہ اسلامی علوم وفنون اور زبان و ادب کے حوالے سے جو بھی کام ہوا عربی زبان سے تعلق کو مضبوط سے مضبوط کرتا چلا گیا سو جب اشاریے بنانے کا آغاز ہوا تو قرآن کریم ہی پہلا مرکز نگاہ قرار پایا۔ڈاکٹر زبید نے قرآن کریم کے اشاریے کے طور پر لکھی گئی ہندوستان کی کتابوں تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

ھادیہ قطب شاہی: محمد علی کربلائی نے مرتب کی سن ترتیب (۱۰۲۰ ھ تا ۱۰۸۳ھ ۱۶۱۱ تا ۱۶۷۲ء) ہے۔

نجوم الفرقان: مصطفی بن محمد سعید نے مرتب کی اس کا انتساب اورنگ زیب عالمگیر کے نام کیا گیا ہے یہ پہلے اور آخری حروف کے لحاظ سے صرف آیات کا ہی نہیں بلکہ قرآن پاک کے ہر ایک لفظ کا اشاریہ ہے۔[۲۷]

یہ عربی علوم کی ترقی اور عربی زبان کا ارتقاء ہی ہے جو برصغیر کے نامساعد حالات اور دگرگوں سیاسی کیفیت کے باوجود اپنا سفر طے کرتا رہا پڑھنے والا ہمیشہ حیرت میں ڈوبا رہے گا کہ اس خطے میں غیر مذہب اور غیر زبانوں کے بولنے والے کے درمیان اس طرح کے تخلیقی کارنامے کہ جن کا اعتراف اہل زبان بھی کرتے رہے ہیں کیسے وجود میں آگئے ،ایک پڑھنے والے کے جذبات میں ہلچل سی مچ جاتی ہے جب وہ اہل اسلام کے ان کارناموں کو دمکتا ہوا دیکھتا ہے اس کی آنکھیں وفور فخر سے جگمگا اٹھتی ہیں اور ہاتھ ان محترم ہستیوں کے درجات کی بلندی کے لئے اٹھ جاتے ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو دین اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دیا اور ہندوستان کی سرزمین پر ہوتے ہوئے اللہ اور اس کے رسول کی زبان کی تبلیغ واشاعت اور فروغ کے لئے اپنا تن من دھن سب قربان کر دیا۔ڈاکٹر زبید نے اس کام کو بڑی حد تک سمیٹ کر یکجا کرنے کا ایک کارنامہ انجام دے کر ہمارے فخر کا ساماں پیدا کر دیا ہے۔

''علم فقہ'' کا میدان اہل برصغیر کے لئے بڑا پرکشش اور دلچسپی سے معمور رہا ہے یہاں کے فتاوی اہل عرب کے لئے

مفید اور مشعل راہ ثابت ہوئے ڈاکٹر زبید نے اہل فقہ کے جن ناموں کا ذکر کیا ہے وہ مختصراً یہ ہیں۔

☆ الفتاوی الحمادیة :از ابو الفتح رکن بن حسام

☆ ابراهیم شاهیة فی الفتاوی الحنفیة از شهاب الدین احمد بن محمد

☆ فتاوی جامع البرکات از ابو البرکات

☆ خزانه الروایات :از چکن الهندی

☆ فتاوی عالمگیری: یہ کتاب ''الفتاوی الهندیه'' کے نام سے مشہور ہے برعظیم پاک و ہند اس موضوع پر جتنی کتب لکھی گئیں ان سب پر اس کو فوقیت حاصل ہے۔ یہ نہایت ضخیم چھ جلدوں پر مشتمل کتاب ہے جس کو ہندی علماء کی ایک مجلس نے جس کے صدر شیخ نظام تھے مرتب کیا تھا یہ مجلس برعظیم میں اسلامی علوم کے سب سے بڑے سرپرست اورنگ زیب عالمگیر نے مقرر کی تھی۔ اس گرانقدر کتاب کی وجہ سے فقہ سے متعلق عربی ادب میں پاک و ہند کا حصہ بہت اہم ہو گیا ہے۔[۲۸]

اورنگ زیب عالمگیر نے عربی زبان کی تعلیم و تدریس پر خصوصی توجہ دی اس نے ہمایوں سے لے کر شاہجہاں تک کے دور کے برعکس فارسی زبان وعلوم کے مقابلے میں عربی زبان اور عربی علوم کی تعلیم و مدرسین کی سرپرستی کی اس کے دور میں ''فتاوی ہندیہ'' کا مدون ہونا اس بات کا بین ثبوت ہے اورنگزیب نے علمائے دہلی کے علاوہ اردگرد کے مختلف شہروں کے ایسے جید علماء پر مشتمل کمیٹی بنائی جن کو علم الفقہ میں مہارت اور دسترس حاصل تھی اس کمیٹی کے سربراہ شیخ نظام الدین برہان پوری کو مقرر کیا۔ فتاوی عالمگیری کی تالیف آٹھ برسوں میں مکمل ہوئی اور تقریباً چالیس سے پچاس اپنے دور کے نامی گرامی جید علمائے کرام نے دن رات کی محنت شاقہ کے بعد اس خدمت کو سرانجام دیا۔

برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی بڑی اکثریت حنفی فقہ کی پیروکار ہے صرف جنوبی ہند میں امام شافعی کے کچھ پیروکار موجود ہیں یہ لوگ زیادہ تر عربوں کی اولاد ہیں جو جنوبی ہند سے آئے تھے یہ عرب شافعی تھے اور ان کی اولاد بھی اکثر و بیشتر اس مسلک کی پیروکار رہے مالا بار میں شافعی اکثریت میں ہیں اور وہاں عربی کی تعلیم ایسی ہی مقبول رہی ہے جیسی کہ شمالی ہند میں فارسی۔[۲۹]

عرب سیاحوں کی آمد اور مبلغین کے اسفار تبلیغ ہندوستان کی سرزمین پر علم و فضل کے خزانے بکھیرتے رہے ہیں جن کی کوششوں اور جدوجہد سے جہاں دین اسلام پھیلا وہاں عربی زبان کا فروغ بھی ہوا مسعودی کے ہندوستان کے سفر کو بڑی

اہمیت حاصل ہے۔علامہ مسعودی کا سلسلہ نسب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ صحابی رسول سے جاملتا ہے۔علامہ مسعودی کی پہلی منزل یہی خاک ہندوستان ہے برصغیر کے رہنے والے ناز کر سکتے ہیں کہ ایسے ایسے جلیل القدر علماء اور نابغہ روزگار ہستیاں اس خطے کے اعزاز کو بلند کرنے یہاں آئیں اور اپنے انمٹ نقوش چھوڑ گئیں وہ لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں جب بھی اندورنی ہند پر مسلمانوں نے کوئی لشکر کشی نہ کی تھی محض تبلیغ کے زیر اثر وہاں جا بجا مسلمانوں کی طاقتور نو آبادیاں قائم تھیں۔ہندو راجاؤں کی جانب سے ان کی عزت و بزرگ داشت ہوتی تھی اور وہ آزادانہ اپنے اسلامی فرائض انجام دیتے تھے، بلکہ بعض ہندو درباروں کا تو یہ گمان تھا کہ ''ان کی شان عظمت و بقائے حکومت مسلمانوں ہی کے تقدس و یمن و برکت سے وابستہ ہے۔[۳۰]

حضرت نظام الدین اولیاء جیسے عظیم صوفی اور ولی کے روحانی سلسلے سے برصغیر کے رہنے والوں کے دل ابھی تک جڑے ہوئے ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا عربی خطبہ جواب تک پڑھا جاتا ہے نہ صرف برصغیر میں بلکہ عرب دنیا میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔یہاں کے اولیاء ائمہ کرام وعلماء نے سندھ، ملتان، لاہور اور دہلی کے اسلامی علوم کے مایہ ناز شہر بناڈالے۔بقول ڈاکٹر زبید:

''چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں ہند میں مسلمانوں کی صرف ایک ہی سلطنت نہ تھی بلکہ اسلامی ہند مسلمانوں کی کئی سلطنتوں میں منقسم تھا ان میں سے اکثر حکومتوں میں اسلامی علوم کی بہت سرپرستی کی گئی اور عربی کے کئی عالم اور مصنف پیدا ہوئے۔[۳۱]

''فارسی، ترکی اور عربی میں ہندوستان کے ماہرین ان ممالک کے مقامی تبحر علما سے بہ آسانی سبقت لے جاسکتے تھے۔غیر ملکی مسلمان یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے کہ ان کی زبانیں ہندوستان میں کس قدر وضاحت کے ساتھ بولی جاتی ہیں۔ سلطنت دہلی تمام ہم عصر علوم وفنون کے بہترین مراکز کا مقابلہ کرتی تھی۔ہمیں سلطنت کے اس علوم رتبت پر کوئی تعجب نہیں ہوسکتا جب ہم سنجیدہ تاریخ میں یہ واقعہ پڑھتے ہیں کہ صرف دارالحکومت میں ایک ہزار دارالعلوم تھے۔اس کے علاوہ دہلی اور اس کے نواح میں مسجدوں اور خانقاہوں کی تعداد دو ہزار بتائی جاتی ہے تقریباً ہر مسجد اور خانقاہ کے ساتھ ایک مکتب ہوتا تھا۔اس طرح دہلی کے شہر اور صوبے میں تعلیمی درس گاہوں کی تعداد لازماً بہت کثیر رہی ہوگی۔مملکت ہزاروں اساتذہ کو برسرکار رکھتی تھی۔ [۳۲]''

اسلامی علوم فنون کی ترویج واشاعت ہو یا علوم اسلامیہ کی تبلیغ، حج کی برکات کو جو اسلام کے ارکان میں سے اہم رکن ہے فراموش نہیں کیا جا سکتا جہاں ایک روحانی عبادت ہے وہاں دنیا میں اتحاد بین المسلمین کا سب سے بڑا مظہر بھی یہی ہے۔دنیا بھر کے مسلمانوں کی اس سالانہ کانفرنس میں عالمی برادریوں کا شیر وشکر ہونا اور ایک پاکیزہ ماحول میں حصول تزکیہ نفس کے ساتھ ساتھ حصول برکات ورزق بھی سمیٹنا یہ صرف اسلام ہی کا خاصہ ہے کسی دوسرے مذہب میں ایسی مثال موجود نہیں ہے حج بھی عربی زبان کے فروغ کا بہترین وموثر ذریعہ ہے اہل ہند کی حجاز مقدسہ سے انسیت وقلبی لگاؤ کسی سے پوشیدہ نہیں یہی وہ قوم ہے جس نے اہل حجاز کی کسمپرسی کے ایام میں ان کی مالی امداد کو اپنی دینی ذمہ داری سمجھتے ہوئے وہاں مدارس سے لیکر تجارتی مراکز تک کے قیام کا اہتمام کیا اہل برصغیر جب وہاں جاتے تھے تو وہیں کے ہو رہتے جب کہ وہاں ان کے قلبی سکون اور روحانی اطمینان کا باعث صرف وصرف حرمین شریفین ہی تھے وہ وہاں رہتے اور سالوں بلکہ عمر کا بہترین حصہ وہاں گزار دیتے جب کہ ان دنوں وہاں وہ مراعات وسہولیات نہ تھی جو آج موجود ہیں یا جو ان کے پاس ان کے اپنے وطن میں موجود تھیں لیکن وہ محض دینی علوم کے حصول اور اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں وہاں مقیم رہتے اور وہاں کے علماء ومشائخ سے کسب فیض کرتے ان میں سے بہت سے وہاں شادیاں کر لیتے اور جب ہندوستان واپس لوٹتے تو عرب خواتین بحیثیت شریک حیات ان کے ہمراہ ہوا کرتیں۔اسی طرح عرب باشندے بھی برصغیر میں آ کر آباد ہو گئے۔ڈاکٹر زبید کے مطابق:

''جب سلاطین گجرات کافی طاقتور ہو گئے اور ان کا اقتدار ساحلی علاقوں تک پھیل گیا تو انہوں نے بحری سفر کو منظّم اور محفوظ کر دیا جس سے ایک تو حاجیوں کے لئے بڑی سہولت ہوگئی اور دوسرے بہت سے علماء عرب سے آ گے احمد آباد اور دکن ریاستوں میں سکونت اختیار کرنے لگے۔ان علماء کی آمد سے احمد آباد رفتہ رفتہ اسلامی علوم کا اہم مرکز بن گیا۔[۳۳]

''گو کہ ہندوستان میں عربی زبان کی مقبولیت اور عروج وہ نہ ہو سکا جو کہ فارسی کا ہوا تاہم پھر بھی اس زبان میں اہل ہند کو ایک خصوصی کشش محسوس ہوتی رہی اس کشش ہی کی بنا پر فیضی نے ''سواطع الالہام'' لکھ ڈالی جو کہ صنعت مہملہ میں ہے اس مصنف نے ''موارد الکلم'' بھی لکھی یہ کتاب بھی غیر منقوط ہے۔یہ غالبًا اسی کشش کا نتیجہ ہے کہ جب شاہ ولی اللہ نے ''الفوز الکبیر'' لکھی جو فارسی میں تھی تو مدراس کے ایک شخص نے عربی میں اس کا ترجمہ کیا۔''(۳۴)

''عبدالحق دہلوی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب انہوں نے مشکواۃ کی شرح فارسی میں لکھنا شروع تو بعض ایسے علمی مباحث اور لطیف نکات سے سابقہ پڑا جو فارسی میں نہیں بیان کئے جا سکتے تھے۔چنانچہ انہوں نے عربی میں ایک شرح لکھنے

کا فیصلہ کیا اور جب عربی میں شرح لکھنا شروع کی تو فارسی شرح نامکمل رہ گئی اور عربی مکمل ہوگئی۔[۳۵]

''الجواہر الخمسۃ'' نامی کتاب محمد بن خطیر الدین نے لکھی تھی جو ''غوث گوالیاری'' کے نام سے معروف ہیں اور عربی میں اس کا ترجمہ ان کے ایک مرید ''صبغت اللہ'' نے کیا جو گجرات میں بھروج کے باشندے تھے۔[۳۶]

غالب غزل کے شاعر ہیں دوسرا فارسی اور اردو کے شاعر ہیں لیکن عربی زبان اس وقت ہندوستان میں علمی و ادبی حلقوں میں چند پسند کی جاتی تھی اس کا اندازہ غالب کی شاعری سے بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ ''قادر نامہ'' ہے۔قادر نامہ غالب کی ایک نظم ہے یہ نظم ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد پورے ہندوستان میں بے حد مقبول ہوئی۔ جناب بہادر یار جنگ نے ایک مرتبہ جب ان کے سامنے اس کا ذکر آیا، بیان کیا کہ انھوں نے اپنے بچپن میں قادر نامہ پڑھا تھا۔۱۲۷۲ھ میں مطبع سلطانی قلعہ مبارک سے''قادر نامہ' کی اشاعت ہوئی۔جس کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی بیان کرتے ہیں کہ،

''ایک نسخہ ۱۲۷۲ھ کا ہے جس پر یہ عبارت درج ہے کہ قادر نامہ تصنیف کیا ہوا نجم الدولہ مرزا اسداللہ خان بہادر متخلص بہ غالب در مطبع سلطانی واقع قلعہ مبارک ۱۲۷۲ھ میں چھپا۔[۳۷]

اس کتاب کا نام''قادر نامہ''یوں رکھا گیا کہ اس کتاب کا پہلا لفظ قادر سے شروع ہوتا ہے اور اس قسم کی نصابی کتابوں کو پہلے لفظ سے موسوم کرنے کی روایت چلی آ رہی ہے۔[۳۸]

قادر نامہ میں اردو اور فارسی کے ساتھ ساتھ بہت سے الفاظ ہیں جو عربی کے ہیں مثلاً:

(قادر)اور (اللہ) اور (یزداں) خدا — ہے (نبی، مرسل، پیمبر) رہنما
پیشوائے دیں کو کہتے ہیں (امام) — وہ رسول اللہ کا قائم مقام
ہے(صحابی)دوست،خالص(ناب)ہے — جمع اس کی یاد رکھ (اصحاب) ہے
ہے (صلوٰۃ) اے مہرباں اسم نماز — جس کے پڑھنے سے ہو راضی بے نیاز
(اسم) وہ یہ جس کو تم کہتے ہو نام — (کعبہ،مکہ)وہ جو ہے(بیت الحرام)
گرد پھرنے کو کہیں گے ہم(طواف) — بیٹھ رہنا گوشے میں ہے(اعتکاف) [۳۹]

اس کے علاوہ بھی چند مثالیں ہم نے غالب کی یہاں دی ہیں صرف دلیل کے طور پر کہ عربی الفاظ اردو شاعری میں کس طرح اپنی جگہ بنا رہے تھے اور اردو شاعری میں انھیں پذیرائی حاصل ہو رہی تھی۔مثلاً

بسکہ فعال مایرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستان کا [۴۰]
آپ نے 'مسّنی الضر' کہا ہے تو سہی
یہ بھی یا حضرت ایوب گلا ہے تو سہی [۴۱]

غالب نے اپنی شاعری میں اس طرح کے عربی الفاظ وترکیبات کا استعمال خوب کیا ہے۔
''بردلیالی'' کا استعمال دیکھیے کس طرح کیا ہے:

گرم فریاد رکھا شکل سنہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردلیالی نے مجھے [۴۲]
مرحبا اے سرور خاص خواص
جندا! اے نشاط عام عوام [۴۳]

عربی زبان سے ہمارا معاشرہ اب تک نا آشنا ہے یہ تصور کہ عربی زبان کو نہ پڑھا جائے اور نہ سمجھا جائے بلکہ اپنی زندگیوں سے خارج کر دیا جائے ایک بڑا واضح پس منظر رکھتا ہے مگر چونکہ یہ ہمارا موضوع نہیں اس لیے اس پر تفصیلی بحث ممکن نہیں ہاں البتہ ہم محض عربی کی ارتقاء میں سست رفتاری کی وجوہات واسباب سمجھنے کی کوشش ضرور کریں گے اسی لحاظ سے چند ایک مثالیں ہمارے لیے کافی ہوں گی تا کہ بات کی خوب وضاحت ہو جائے اور اس پر ہمیں محققین و دانشوروں کے دلائل میسر آ جائیں۔ یہاں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے کا خیر مقدم کرتے ہوئے شامل کروں گی لکھتے ہیں۔

''عربی و فارسی سے عدم واقفیت اور ان کے ادبی مذاق سے نا آشنائی کی ساری ذمہ داری آج کے اردو کے قاری پر اس لئے نہیں ڈالی جاسکتی کہ ہماری درس گاہوں سے ان کی تعلیم کا سلسلہ قریب قریب ختم ہو گیا ہے اور کہیں ہے بھی تو برائے نام یعنی شعبے تو قائم ہیں لیکن پڑھنے والوں کی تعداد دو چار سے زیادہ نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اردو کے عام یا خاص قاری سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عربی کے فقروں، کہاوتوں اور عربی مصرعوں سے بوجھل اردو زبان کی خاطر خواہ داد دے سکے گا غلط ہے الفاظ بذات خود اہم ہوں یا نہ ہوں لیکن کلام میں خیال کی نمائندگی وہی کرتے ہیں اس لئے جب تک کوئی شخص الفاظ کے معنی اور معنی کے اندر چھپے ہوئے تلازموں کو نہ سمجھتا ہو وہ خیالات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔[۴۴]

یہی وجہ ہے کہ نعت گو شاعروں نے عربی زبان کے فقروں کو باقاعدہ سمجھتے ہوئے بھی اپنی شاعری کا جز بنانے سے گریز کیا اور صرف وہی فقرے الفاظ یا تراکیب استعمال کیں جو ہمارے ہاں زبان وادب میں معروف تھیں اور جانی پہچانی جاتی تھیں۔مثلاً ورفعنا لک ذکرک ،لاتقنطوا،رحمة للعالمین ،والیل والشمس والدحی ،بدر الدجیٰ.شمس الھدی ،مازاغ البصر،صل الله علیه وسلم صلو علیه وآله ،وغیره

درحقیقت ہمارے شعرا وادیب عربی زبان کے دلدادہ تو ہیں اور وہ اس خطے میں عربی شاعری کو متعارف بھی کروانا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے ان کے دل میں ایک خدشہ ہے وہ یہ کہ عربی زبان میں ہم سے کوئی غلطی نہ ہو جائے خصوصاً جب قرآن اور حدیث یا شرعی علوم کا معاملہ ہو تو یہ احتیاط حد درجہ بڑھ جاتی ہے وہ بلا جھجک نہیں لکھتے اس وجہ سے بھی عربی کے سیکھنے سکھانے میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔عصر حاضر میں کچھ شعراء نے عرب شعراء کے کلام کا ترجمہ بھی کیا ہے جیسا کہ نزار قبانی کی ایک نظم ہے "جوار مع اعرابی اضاع فرسه" "ایک بدو جس کا گھوڑا گم ہو گیا ہے"۔جناب امجد اسلام امجد نے اس عربی نظم کا اُردو میں ترجمہ آزاد نظم میں کیا ہے۔

اگر یہ صحرائے نجد میری فغاں سنے تو اسے بتاؤں
مرے تصرف میں ہو تو لفظوں کے کارخانوں کو سرخ
لہروں سے بند کر دوں!
حروف ابجد کے شہسواروں کو قتل کر دو
کہ جب سے ہم نے جنم لیا ہے
یہ ہم کو لفظوں کی چکیوں میں کچل رہے ہیں
اگر میں اپنے وطن میں کوئی مقام رکھتا
تو ایسے لوگوں کی انگلیوں کو تراش دیتا
جو اپنے لفظوں کو ظالموں کے غلیظ جوتوں پر پھیرتے ہیں
اور ان میں ایسی چمک دکھاتے ہیں جو بھی دیکھے
خود اپنے چہرے سے دوبدو ہو [۴۵]

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''زبان کی حیثیت ایک مست خرام ندی کی سی ہے۔اس میں اطراف و جوانب سے تازہ پانی شامل ہوتا رہتا ہے اور باسی پانی سمندر کی نذر ہو جاتا ہے۔زبانوں کے فروغ اور ارتقاء کے اس فطری عمل پر قواعد وضوابط کی بندشیں عائد کر دی جائیں تو یہ فطری عمل رک جاتا ہے اور زبان پہلے سے بوجھل ہو جاتی ہے اور پھر جامد ہو جاتی ہے۔انشاء اللہ خان انشا کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ جب قدیم اساتذہ کی تقلید تقاضہ فن اور اردو زبان فارسی لب و لہجے اور صورت اور ہم آہنگی کی نقیب بن گئی تو انشاء نے جو آزاد فکر، وارفتہ مزاج اور درویش مشرب تھا اپنا چراغ ہوا کے مخالف رخ جلایا اور مقامی زبانوں کی اہمیت کو اجاگر کرنا شروع کر دی'' [۴۶]

ان شاء اللہ خان انشاء نے جو تحریک چلائی یا اپنی راہ متعین کی اس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ محض ہندوستان کی روایتی زبانوں کو فروغ دینے کے خواہشمند تھے بلکہ بات یہ ہے کہ وہ زبان ادب کو فطری انداز دینا چاہتے تھے تا کہ وہ ادبی فن پارے چند مخصوص لوگوں تک محدود نہ ہو جائیں بلکہ ان سے ہر خاص و عام محظوظ ہو سکے اردو کے صحیح معنوں میں ہمنوا تھے اور چاہتے تھے کہ اردو میں پیوندکاریاں نہ ہوں لب ولہجہ اجنبی نہ ہو اور کلام برجستہ ہو۔چنانچہ اپنی تصنیف رانی کیتکی کی کہانی میں جو انجمن ترقی اردو نے شائع کی ہے ایسی اردو دے رہے ہیں جس میں صرف اردو الفاظ ہی کا استعمال ہے عربی و فارسی کا نہیں۔جب کہ وہ خود عربی اور فارسی کے جید عالم تھے ترکی اور ہندی زبان کے ساتھ ساتھ کئی علاقائی زبانوں میں بھی مہارت رکھتے تھے تو وہ کیوں ان زبانوں کے الفاظ کو اپنی زبان میں یا اپنی ادبی زبان میں استعمال کرنے سے گریز کریں گے۔

ہمارے اس سوال کا جواب ہی ان کی کہانی میں موجود ہے۔کہتے ہیں:

''ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھی کوئی کہانی ایسی کہیئے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بولی کی پُٹ نہ ملے۔'' [۴۷]

اور آگے خود ہی بتا دیتے ہیں کہ یہ کسی بزرگ نے ان کو چیلنج دیا تھا کہ تم ایسا نہ کر سکو گے سو اس کے جواب میں یہ کہانی لکھ کر دکھائی۔یہ کہانی محض انشاء کی افتادِ طبع کا نتیجہ ہے۔انہوں نے اور ان جیسے خیالات رکھنے والوں نے نہ تو عربی و فارسی کے الفاظ کو اردو میں شامل کرنے سے روکا اور نہ ہی لوگ رکے بلکہ جوں جوں بیسویں صدی اپنے اختتامی مراحل میں داخل ہوتی چلی

گئی اردو میں عربی زبان کے الفاظ کی آمیزش بڑھتی چلی گئی۔ جب کہ ہندی و فارسی الفاظ کم سے کم ہوتے چلے گئے۔
برصغیر میں اردو زبان کے ارتقاء کا جائزہ لیں اور شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور سید احمد شہید و شاہ اسمعیل شہید کو نظر انداز کر دیں یہ ممکن نہیں، یہ علماء ان تحریکوں کے سرخیل ہیں جن کے بڑے گہرے اور دیرپا اثرات اس خطے کے تہذیب و تمدن، معاشرت اور زبان و ادب پر مرتب ہوئے انہوں نے قرآن کریم کا پہلی مرتبہ برصغیر میں سمجھی جانے والی زبان میں یعنی فارسی میں ترجمہ کیا ،اوران کے بیٹے شاہ عبدالقادر نے قرآن کو با محاورہ اردو میں ترجمہ کر کے عام لوگوں تک پہنچانے کا ناقابل یقین کارنامہ انجام دیا کہ اس زمانے میں قرآن کا ترجمہ کرنا انتہائی بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا۔
شاہ عبدالعزیز ایک عالم دین ضرور تھے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو محدود رکھنے کی بجائے دیگر علوم فنون کو سیکھنے کی طرف متوجہ کیا یہاں تک کہ اردو زبان پر دسترس حاصل کرنے کے لئے میر درد کی شاگردی اختیار کی یہاں تک کہ ذوق نے ان کے ادبی و علمی خطابات کو سن کر اپنی اصلاح کی کیا اس طرح عربی زبان کے اثرات کا اور ارتقاء کا سفر جاری رہا۔
عربی زبان اور مشترقین: عربی زبان کی ترویج و اشاعت میں چند مشترقین کا بھی ہاتھ ہے جس میں ''اسپرنگر'' جیسے معروف محقق کی خدمات سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا گو کہ ان سے کئی مواقعوں اور نظریوں پر شدید اختلاف ہوسکتا ہے لیکن جو کچھ ان کے ذریعے اچھا ہوا اس کی تعریف بھی ضروری ہے۔
ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''مسٹر بوترو کے بعد جب ڈاکٹر اسپرنگر نے پرنسپل کا عہدہ سنبھالا تو علم اور عمل کے دو دھارے آپس میں مل گئے اور ترجمہ و تالیف کے کام میں مزید تحرک حاصل ہوگیا۔ ڈاکٹر اسپرنگر عربی زبان و ادب کے عالم بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے حماسہ اور متنبّی کو نصاب میں شامل کروایا اور تاریخ یمینی کو ایڈٹ کیا۔ ''صحیح بخاری اور بہارِ عجم'' کی اشاعت اور ''آثار الصنادید'' کی تالیف کی تحریک پر ہوئی۔ انہوں نے ''قرآن السعدین'' کے نام سے کالج کا مجلّہ جاری کیا۔ چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ دلی کالج میں تراجم کی بدولت جس نشاۃ ثانیہ کا سورج طلوع ہوا اس کے پس پشت ڈاکٹر اسپرنگر کی متحرک شخصیت ہی سرگرم عمل تھی''۔[۴۸]

عربی زبان کے ارتقاء میں اسلامی تہذیب وتمدن کا کردار:

برصغیر پاک و ہند میں عربی زبان کی ترویج و اشاعت اور ارتقا میں اسلامی تہذیب وتمدن کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۵ھ میں سیدنا عمر فاروقؓ کے عہد میں عثمان بن ابی العاص الثقفی کی سرکردگی میں سندان نواح میں تھانہ اور بھڑوچ اور دیبل پر اسلامی فوج نے جہاد کیا اور یقیناً یہاں مساجد کا قیام عمل میں لایا گیا ہوگا جیسا کہ اسلامی لشکر کی روایت رہی ہے کہ وہ جہاں بھی جاتے اپنی عبادت کے لیے کوئی نہ کوئی مسجد اپنی قیامگاہوں، خیمہ گاہوں یا آبادیوں کے درمیان ضرور قائم کیا کرتے بعد میں جب وہاں ان کو استحکام حاصل ہو جاتا تو عرب طرز تعمیر پر مشتمل بستیاں بھی تعمیر کرتے، ان کا وہاں قیام مقامی لوگوں کے ساتھ میل جول گویا عربی زبان کے فروغ کی پہلی سیڑھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

''ہندوستان وہ خوش نصیب ملک ہے جس میں ایک جلیل القدر صحابی کے دور خلافت میں پہلا اسلامی شہر آباد کیا گیا یعنی حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں حضرت سنان بن سلمہ ہذلیؓ نے مکران میں کیز نامی شہر تعمیر کر کے اسے دارالامارہ اور مسلمانوں کا مرکز قرار دیا۔'' [۴۹]

''اس ملک میں دوسرا شہرا اسلامی شہر ''محفوظہ'' آباد کیا گیا اور جنوب میں سندھ کے آخری سرے پر کچھ اور سوراشٹر سے قریب ہونے کی وجہ سے اسلامی قلمرو کے وسط میں اسے مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔'' [۵۰]

مسلمانوں کے بسائے گئے شہروں میں ''منصورہ'' نامی شہر شہرہ آفاق حیثیت کا حامل ہے یہ ایسا شاندار علمی شہر تھا کہ آج بھی اس نام سے شہر بسانا باعث فخر سمجھا جاتا ہے جیسا کہ جماعت اسلامی نے اپنا ایک مرکز اس نام سے لاہور میں قائم کیا ہے۔

''منصورہ اور اس کے اطراف کی زبان عربی تھی اور اسی کے ساتھ سندھی زبان بھی رائج تھی، الغرض تقریباً ۱۰۵ھ سے ۴۱۶ھ تک سندھ کا یہ اسلامی شہر مسلم حکمرانوں کا مرکز اور اسلامی تہذیب وثقافت کا مظہر رہا۔'' [۵۱]

خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے جب حکم بن عوانہ کلبی جیسے مدبر اور شجاع کے ہاتھ میں ہندوسند کی امارت دی تو عمرو بن محمد بن قاسم ان کے ساتھ بطور نائب تھے انہوں نے پہلے ''المحفوظہ'' نامی شہر بسایا اور پھر جب ایک مہم سے واپس آئے تو ان کو دریا کے قریب ایک نیا شہر بسانے کا حکم دیا۔

"فاغزاه من المحفوظه فلما قدم عليه و ظفر امره ان يبنى دون البحيره مدينة سماهاالمنصورة فهي التي ينزلها العمال اليوم." [۵۲]

ترجمہ: جب وہ محفوظہ سے ایک مہم پر گئے اور وہاں سے کامیاب و کامران لوٹے تو انہوں (حکم بنعوانہ) نے ان (عمرو بن محمد بن قاسم) کو حکم دیا کہ سمندر سے ذرا آگے ایک شہر بسائیں اسکا نام منصورہ رکھیں ، سو یہ وہی ہے جہاں انتظامی امور سنبھالنے والے سرکاری لوگ رہتے ہیں۔،،

سندھ کا نام آئے اور دیبل ذہن میں نہ آئے دیبل ۱۵ھ ہجری میں خلیفہ راشد سیدنا عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں فتح ہوا، دیبل کو مسلمانوں کے تاریخی شہر ہونے کے ساتھ ساتھ باب الاسلام ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ دیبل کا شہر سندھ میں محدثین اور رواۃ حدیث سب سے پہلا اور اہم مرکز تھا۔ منصورہ کے بعد دولت ہباریہ کا دوسرا بڑا شہر دیبل ہی تھا محمد بن قاسمؒ نے یہاں راجہ داہر کے نائب حاکم کو شکست دے کر چار ہزار مسلمانوں کو یہاں آباد کیا، بقول بلاذری ،

" و اختط محمد للمسلمین بها و بنی مسجدا و انزلها اربعة آلاف "[۵۳]

ترجمہ: محمد بن قاسم نے یہاں مسلمانوں کے لیے ایک منصوبے کے تحت ایک شہر بسایا اور وہاں ایک مسجد بنائی اور چار ہزار مسلمانوں کو وہاں آباد کیا۔

''دیبل منصورہ کر بعد سندھ میں اسلامی علوم وفنون اور رجال اسلام کا دوسرا مرکز بنا دیبل کو بعد میں ٹھٹھہ کہنے تھے جو موجودہ کراچی کے پاس ہے۔''[۵۴]

''الور'' نام کا شہر ہباری حکومت میں علمی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا عربی زبان میں یہ ''الرّور'' کہلایا اس کے متعلق قاضی اطہر مبارکپوری کہتے ہیں،

''پہلی صدی ہجری کے خاتمے پر محمد بن قاسم نے اسے فتح کرکے ایک مسجد تعمیر کی اور یہاں مسلمان حاکم و قاضی اور خطیب مقرر کیا اسی زمانے سے الور سندھ کے مسلمان امراء وحکام کی اطاعت و امان میں رہا۔'' [۵۵]

''خلیفہ معتصم کے زمانے میں عمران بن موسی برمکی نے بوقان ہی میں بیضاء نامی شہر آباد کیا تھا بوقان مرکزی شہر تھا اور یہاں سے کئی علماء ومحدثین اٹھے ہیں۔'' ''و بنی مدینةو سماهاالبیضاء''[۵٦]

''تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ سندھ مکران کے بعض علاقوں میں مسلمانوں کے نام سے آبادیاں موجود تھیں اس کی صورت یہ تھی کہ کسی قبیلے کے سردار یا کسی صاحب حیثیت مسلمان نے جس قریہ یا بستی کو آباد کیا، اس میں سکونت اختیار کی وہ اسی کے نام سے منصوب ہوگئی چنانچہ مکران اور منصورہ کے درمیان سرائے خلف اور قریہ سلیمان بن سمیع غالبا اسی قسم کی آبادیاں تھیں

جو اپنے مسلمان بانیوں یا باشندوں کے نام سے مشہور ہوئیں۔'' [۵۷]

دو مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے باہمی تعلقات کو مضبوط بنانے میں اور ان زبانوں کی نشونما میں ترجمہ کرنے والوں کا بھی بہت بڑا کردار ہوتا ہے اور جہاں بات تجارتی، اقتصادی اور سیاسی امور کی ہو تو اس کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے چنانچہ برصغیر میں بھی عربی زبان کے فروغ اور نشو ونما میں ترجمانوں کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا عربی سے مقامی زبانوں میں اور مقامی زبانوں سے عربی میں ترجمے کی ضرورت کے تحت یہاں کے رہنے والوں نے عربی سیکھی اور عربوں نے مقامی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ یہ ضرورت عام میل جول سے لے کر راجاؤں، مہاراجاؤں، خلفاء وسلاطین کے درباروں تک پیش آئی۔

بقول قاضی اطہر مبارکپوری،

''امویوں کے دور میں امرائے فوج اور امرائے بلاد کے ساتھ ترجمان بھی ہوا کرتے تھے۔ جو مقامی باشندوں ی باتوں کو امراء و حکام کے سامنے رکھا کرتے تھے اور درمیان میں ترجمان کی خدمت انجام دیا کرتے تھے یہ لوگ عربی زبان کے ساتھ مقامی زبانوں میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ترجمان کے ذریعے بڑے بڑے کام لیے جاتے تھے۔'' [۵۸]

''ہندوستان میں بھی ترجمان ہوا کرتے تھے وہ یہاں کے عوام اور عرب حکمرانوں کے درمیان ترجمانی کیا کرتے تھے۔ محمد بن قاسم کے کی فتوحات کے درمیان مقامی باشندوں سے ترجمان کے ذریعے گفتگو ہوا کرتی تھی ان ترجمانوں میں نباتی بن حنظلہ کلبی اور خذیم النائم کا نام بار بار آتا ہے انہوں نے محمد بن قاسم کے اور ہندوستانیوں میں بات چیت کے ذریعے متعدد مقامات پر صلح و مصالحت میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ جنید بن عبدالرحمان مری کے ساتھ ابو ہاشم بکیر بن ہامان کوفی ترجمان کی حیثیت سے رہتا تھا۔'' [۵۹]

''اموی دور میں ہندوستان کے دینی، علمی، فکری اور ذہنی کیف وکم میں نہایت خوشگوار اضافہ ہوا اور عرب و ہند نے ایک دوسرے کے علم وفن میں حصہ لیا۔ اس وقت دونوں طرف ایسے زباندان اور ترجمان موجود تھے جو ہندی سے عربی میں اور عربی سے ہندی میں ترجمہ کرتے تھے۔ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدمت میں ارض چین اور ہندوستان کے راجوں اور مہاراجوں نے ہندی علوم وفنون اور اسرار و حکم پر مشتمل کتابیں روانہ کیں۔ ہمارے علم و تحقیق میں عرب و ہند کے درمیان یہ پہلا علمی سلسلہ تھا جو اسلام فہمی کے داعیہ پر جاری ہوا تھا اور خالد بن یزید نے اس سے خوب خوب

استفادہ کیا۔ اگر یہ کتابیں یہاں سے عربی زبان میں روانہ کی گئیں تھیں تو یہاں عربی کے ماہرین موجود تھے جنہوں نے ان کو مرتب کیا تھا اور اگر ہندی میں تھیں تو عرب میں اس زبان کے جاننے والے موجود تھے تھے جنہوں نے ان کو عربی زبان میں منتقل کیا تھا نیز حجاج بن یوسف کے دربار میں نیرون سے دو سمنی گئے تھے جو بدھ مذہب کے عالم و پیشوا اور سومناتی فلسفے کے نمائندے تھے اور خود سندھ میں کئی سمنیوں نے محمد بن قاسم سے مل کر ملکی اور شہری امور و معاملات میں ان سے گفتگو کی۔ اموی خلفاء و امراء اور یہاں کے راجوں اور مہاراجوں میں خط و کتابت اغلب یہ ہے کہ اپنی اپنی زبان میں ہوتی تھی اور دونوں طرف کے ترجمان ان کا ترجمہ کرتے تھے۔ یہاں کے بعض راجے عربی زبان سے اچھی طرح واقف تھے اور عربی کے اشعار سنتے سناتے تھے۔'' [٦٠]

عربی زبان کی ترویج و اشاعت اور سیکھنے سکھانے کا عمل خلافت عباسیہ میں بہت آگے بڑھتا نظر آتا ہے عباسی دور خلافت میں سندھ کے حکمرانوں کا حکمرانوں سے رشتہ اور تعلق پہلے سے زیادہ مضبوط ہوا ، چھوٹی موٹی شورشوں کو اگر نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو ہندوستان اور سندھ کے حکمرانوں نے نہایت پر امن طریقے پر خلفاء کا ساتھ دیا جس کے نتیجے میں ان کے آپس کے تعلقات بے حد خوشگوار رہے اور علوم و فنون نے خوب ترقی کی، خاص طور پر سندی بن شاہک اور اس کے خاندان نے خلافت عباسیہ میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ مختصر یہ کہ خلافت عباسیہ کا ایک سو پندرہ سالہ عہد برصغیر کی اسلامی تاریخ کا بھی شاندار عہد کہا جاسکتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ عباسی عہد میں ہند و سند کے دینی، علمی، معاشرتی، معاشی، تہذیبی، ثقافتی اور تجارتی میں ایک انقلاب برپا کردیا جس کے سائے میں یہاں زندگی کا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا۔ امن و سلامتی اور افہام و تفہیم کی اس فضا میں اسلامی تہذیب و تمدن کو پھولنے پھلنے کے بھرپور مواقع میسر آئے اہل ہند و سند کو خلافت کے ایوانوں سے محبت، یگانگت، حوصلہ افزائی، علم دوستی اور معاملہ فہمی کا پیغام ملا تو ان کے علمی و فنی جوہر کھل کر سامنے آئے۔ مامون نے بنگال کے ایک رہمی راجہ کو خط اور ساتھ ایک کتاب کا تحفہ بھیجا تحفے کے بارے میں لکھتا ہے،

''ہم تمہارے پاس ایک کتاب عربی زبان سے ترجمہ کرا کر بھیج رہے ہیں جس کا نام ''**دیوان الا لباب و بستان نوادر العقول** '' ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد تم کو اس اہم نعمت کی قدر و قیمت معلوم ہوگی نیز معلوم ہوگا کہ کتاب کا یہ نام بالکل برمحل اور صحیح ہے۔'' [٦١]

''منکہ ہندی یہاں کے نامی گرامی اطباء میں سے تھا اور بغداد میں اسحاق بن سلیمان ہاشمی کی زیر نگرانی ہندی کتابوں

کا عربی میں ترجمہ کرتا تھا۔"[۶۲]

یہ کئی زبانوں کا ماہر تھا اور بعد میں صحیح العقعد ہ مسلمان ہو گیا تھا۔

عباسی دور میں امن و سلامتی کی فضاء کے میسر آتے ہی عرب و ہند کے درمیان تجارتی روابط پھر سے مضبوط ہونے لگے تجارتی معاملات کے فروغ میں بھی عربی زبان کے ترجمانوں کی ضرورت پڑتی تھی قاضی اطہر مبارک کے مطابق،

"اس دور کے عرب اور مسلمان تاجر جن ملکوں میں آتے جاتے تھے وہاں کی زبان بقدرِ ضرورت جانتے تھے اور فی الجملہ متعدد زبانوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ اسی طرح یہاں کے لوگ عربی زبان کے تجارتی الفاظ و محاورات سے واقفیت رکھتے تھے آج کل اس کی مثال بمبئی میں پائی جاتی ہے جہاں تاجروں اور سیاحوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ قدیم زمانے میں بھی جانبین ایک دوسرے کی زبان سمجھ لیتے تھے اور تجارتی مرکزوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔"[۶۳]

" تجارتی کاروبار میں ایک دوسرے کی زبان سمجھانے کے لیے مترجم ہوتے تھے بہت سے تاجر راجوں مہا راجوں کے دربار میں آتے جاتے تھے۔ ان سے خرید و فروخت کرتے تھے ان کے ہاں سالوں پڑے رہتے تھے اور ہر قسم کی بات چیت کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ طرفین بے تکلفی باہمی گفتگو کر لیا کرتے تھے۔"[۶۴]

جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے مسلمان جہاں جہاں گئے علوم و فنون کی سرپرستی کرتے اور تعلیم و تربیت کے ذریعے ان کے فروغ پر بے حد توجہ دیا کرتے۔ انہوں نے ہندوستان میں بھی ایسا ہی کیا،

"مسلمانوں نے پہلی بار ہندی علوم و فنون کو خاندانی تہہ خانوں سے نکال کر دنیا کے سامنے رکھا اور عام کیا۔ اموی دور میں شرعی اور لسانی علوم پر زیادہ توجہ رہی۔" [۶۵]

"بیت الحکمت میں ہندوستان کے جو مترجم رکھے گئے تھے ہندی اور عربی زبانوں کے ماہر تھے اور یہاں کی علمی فنی اور طبی کتابوں کے ترجمے کرتے تھے۔"[۶۶]

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کسی بھی غیر عرب سرزمین پر عربی زبان کی ترویج اشاعت کا اولین اعزاز ذریعہ قرآن کریم اور اسلامی تعلیمات کی درس و تدریس کو جاتا ہے اور اس کار خیر کے لیے مسلمانوں نے سنت رسول ﷺ کی تقلید میں مسجد کے قیام کو اس کا ذریعہ بنایا چنانچہ مساجد صرف پانچ وقت با جماعت ادائیگی نماز کے لیے نہیں دیگر علوم و فنون کی نشر و اشاعت کے لیے بھی بنائی گئیں، چنانچہ مساجد کا قیام، ان میں اذان، نماز اور دروس قرآن و حدیث کا منعقد ہونا دوسری سیڑھی ہے بڑے

بڑے جید علماء اور ائمہ کرام نے یہاں رہنے کو ترجیح دی ۔سیدنا ابوحفصؒ بن ربیع بن صبیح جو کہ تبع تابعی ہیں اور خواجہ حسن بصریؒ کے شاگردوں میں بڑا مقام رکھتے ہیں ایک غزوے میں شریک ہوکر سندھ آئے اور یہیں کے ہو رہے ۔محمد بن یعقوب الثقفی محمد بن قاسم کے ہمراہ آئے اور الرور کے قاضی مقرر ہوئے ،درس کی مجلسیں بھی منعقد کیا کرتے تھے ۔محمد احمد بن صالح التمیمی منصورہ میں قاضی کے عہدے پر فائز تھے اور وہاں درس بھی دیا کرتے تھے ۔الرور ،منصورہ دیبل ،ملتان ،قصدار میں بہت سی ایسی علمی شخصیات تھیں جو جن درس وتدریس کے توسط سے عربی زبان مقامی لوگوں تک پہنچی ۔

قاضی اطہر مبارک پوری کہتے ہیں ،

"تیسری اور چوتھی صدی کا زمانہ کتاب وسنت اور دینی علوم کے حق میں گویا بہار کے شباب کا زمانہ تھا ،پورا عالم اسلام دار العلم بنا ہوا تھا ،جس میں حاملین علوم گھوم گھوم کر تعلیم وتعلم میں مصروف تھے ،ان کے علمی اسفار نے گویا زمین کی مسافتیں ختم کردی تھیں ،اس زمانے تک مدارس اسلامیہ کا رواج نہیں ہوا تھا بلکہ جوامع اور مساجد اور علماء کے کاشانے دینی درسگاہ ہوا کرتے تھے اور ہر مرکزی شہر علماء وفضلاء کی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہتا تھا ،چنانچہ ہباریوں کا دار السلطنت منصورہ بھی ان ہی کی دینی سرگرمیوں کا مرکز تھا ،یہاں بھی اسی قسم کی درسگاہیں تھیں جن میں علماء محدثین باقاعدہ کتاب وسنت کا درس دیتے احادیث کی روایت کرتے ،فقہ کی تعلیم دیتے ،یہاں دوسرے علوم کے مقابلے میں علوم شرعیہ کا رواج زیادہ تھا ۔" [٦٧]

ہمیں تاریخ میں سینکڑوں علماء محدثین اور فقہاء کے نام ملتے ہیں جن کے ناموں کے ساتھ ان کے شہروں کی نسبت سے دیبلی ،منصوری ،سندھی ،ہندی ، بوقانی ،قصداری ،بامیانی ،لاہوری اور ملیباری لگا ہوا ہوتا ہے ۔یہ نام نہ صرف برصغیر پاک وہند کے لیے بلکہ عالم عرب وبقیہ دنیائے اسلام کے لیے بھی معروف ہیں ۔

اصطخری کا نام ابراہیم بن محمد ہے ایران کے شہر اصطخر کا رہنے والا تھا اس لیے اصطخری کہلایا یہ سیاحت کا شوقین تھا اور ٣٤٠ھ بمطابق ٩٥١ء ہندوستان آیا تھا اس نے مسالک الممالک میں قامہل ،سندان ،چیمور اور کنبائت میں جامع مسجدوں کا ذکر کیا ہے ،

" و من كنباية الى صيمور من بلد بلهرا بعض ملوك الهند و هى بلاد كفر الا ان هذه المدن فيها المسلمون ولايلي عليهم من قبل بلهرا الا مسلم و بها مساجد يجمع فيها الجمعات ۔" [٦٨]

ترجمہ: کمبائت سے چیمور تک ہند کے راجاوں میں سے ایک راجہ بلہرا کا رجواڑہ ہے یہ کافروں کا ملک ہے البتہ اس کے

شہروں میں مسلمان بھی بستے ہیں لیکن راجہ بلہرا ان مسلمانوں کے معاملات سنبھالنے کے لیے مسلمان ہی کو ذمہ دار بناتا ہے اوران شہروں میں مسجدیں بھی ہیں جامعہ مسجدیں جہاں جمعہ بھی ہوتا ہے۔''

چوتھی صدی ہجری اس لحاظ سے بہت زرخیز ثابت ہوئی، یہاں کے راجے مہاراجے مسلمان سربراہوں کی دعوت پر بغیر کسی دباو کے اپنی خوشی سے اسلام میں داخل ہوئے اور انکی وجہ سے ان کی عوام نے بھی اسلام قبول کرنے میں دیر نہیں لگائی، انہوں نے اپنے قدیم ناموں کی جگہ عربی نام رکھے اوراسلامی تعلیمات کو سیکھنے کے لئے خلیفہ اورسلاطین سے رابطے کیے۔ بقول بلاذری،

" فکتب عمر بن عبدالعزیز الی الملوک یدعوهم الی الاسلام و الطاعة علی ان یملکهم ولهم ما للمسلمین و علیهم ماعلی المسلمین ، وقد کانت بلغتهم سیرته و مذهبه فاسلم جیسیه والملوک وسموا اسماء العرب."[۶۹]

ترجمہ: عمر بن عبدالعزیز نے یہاں کرراجاوں کواسلام اورخلیفہ کی اطاعت کی دعوت دی اس بات کی یقین دہانی کراتے ہوئے کہ وہ انہیں انکی حکمرانی پر قائم رکھیں گے اوران کے لیے وہی حقوق ہوں گے جومسلمانوں کے ہیں اوران پر وہی فرائض عائد ہوں گے جومسلمانوں کے ہیں دراصل ان راجاوں کوعمر بن عبدالزیز کی سیرت اور مذہبی خیالات کے بارے میں آگاہی ہوچکی تھی چنانچہ جیسیہ (داہر کا بیٹا) اوردیگر راجا اسلام لے آئے اورانہوں نے اپنے عربی نام رکھے۔

سندھ میں ہباریوں کا دور اسلام کے پھلنے پھولنے میں بہت مددگار ثابت ہوا ہباری حکمراں صحابی رسول ﷺ حضرت ہبارؓ بن اسوداسدی قرشی کی نسل سے تھے ان کی نسل کا ایک شخص منذر بن زبیر ہباری بنوامیہ کے دور میں سندھ میں آکر آباد ہوگیا، ۲۲۷ھ میں اس کے پوتے عمر بن عبدالعزیز بن منذر ہباری نے سندھ پر قبضہ کر کے منصورہ میں اپنی حکومت قائم کی۔اورخلافت عباسیہ کے نام کا خطبہ جاری کیا۔۲۴۷ھ میں خلیفہ متوکل کے قتل کے بعد عمر بن عبدالعزیز نے سندھ میں ایک آزادوخودمختار حکومت کی بنیاد ڈالی یوں پورے سندھ پراس کی حکمرانی ہوگئی ورمنصورہ کواپنا پایہ تخت قراردیا،

''منصورہ کی یہ ہباری حکومت ۴۱۶ھ کے آخر یا ۴۱۷ کے شروع میں سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں ختم ہوئی ہندوستان میں ہباری حکومت نے بڑی شاندار خدمات انجام دی ہیں اور وہ ہراعتبار سے اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق ہے۔'' [۷۰]

سندھ منصورہ اور دیبل علماء وفقہاء کے شہر بن گئے گھروں نے اسلامی تعلیمات کے مدارس کا روپ دھار لیا ان علاقوں کی زبان عربی وسندھی تھیں اور طرز زندگی پر عربی ثقافت کے نمایاں اثرات نظر آتے تھے کہا جاتا ہے کہ منصورہ تو بودو باش میں بغداد کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔اہل ہند وسند کے اسلام لانے کیساتھ ساتھ اہل عرب نے ان نومسلم گھرانوں میں شادیاں بھی کرلیں یوں ایک نسل بھی وجود میں آئی،

''جیسا کہ معلوم ہوا کہ عربی الاصل اور ہندی الاصل مسلمانوں کے علاوہ یہاں مسلمانوں کی ایک قسم اور تھی جسے ''بیسر و بیاسرہ '' کہتے ہیں۔ یہ طبقہ اس جدید تمدن کی پیداوار ہے جو عربوں اور ہندوستانیوں کے درمیان اسلامی تعلقات کی بنا پر پیدا ہوا معلوم ہو چکا ہے کہ خلافت عثمانی میں عربوں کی اچھی خاصی آبادی بلوچستان میں آباد ہوگئی تھی اور یہاں پر عربوں نے مکانات تعمیر کیے،کھیتی باڑی کی،کنویں کھودے اور اپنی پیداوار کا عشر خلافت راشدہ کو روانہ کیا،اس وقت سے عربوں اور ہندیوں میں رشتہ مناکحت قائم ہوا اور اموی دور میں جب کہ یہاں وربوں کی آبادی عام ہوگئی دونوں قوموں میں شادی بیاہ کا رواج بالکل عام ہوگیا اس زمانے میں عرب کے مرد عموما ہندوستان کی عورتوں سے شادیاں کرتے تھے ایسے زن اور شوہر سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی اسے ''بیسر'' اور ''بیسری'' کہتے ہیں۔'' [۱۷]

اس طرح کے نسلی اختلاط بھی ایکدوسرے کی زبانوں کے پھیلاؤ اور نشوونما کا باعث بنتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ اس مخلوط نسل کے طفیل سند اور ہند کو ایسے عالم میسر آئے جنہیں دونوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔آج بھی سندھی زبان،تہذیب و تمدن کی طرح بلوچی تہذیب وتمدن اور زبان پر عربی تہذیب تمدن اور زبان کے اثرات بہت واضح اور نمایاں ہیں۔

سلطان محمود غزنوی کے دور میں انکے وزیر احمد بن الحسن المیمندی نے عربی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیتے ہوئے یہ حکمنامہ جاری کیا کہ تمام سرکاری تحریروں کی زبان عربی ہوگی یہ طریقہ عربوں کی حکومت کے تمام عرصے قائم رہا۔ یہاں سے عربی لاہور پہنچتی ہے جہاں شیخ محمد اسماعیل (۴۴۸ھ) درس تفسیر وحدیث کے زریعے علم کی پیاس بجھا رہے تھے۔سلطان محمد غوری کے دور میں عربی زبان اپنا سفر طے کرتے ہوئے اجمیر اور دہلی جا پہنچی،دہلی میں '' مدرسہ معزیہ'' اور ''مدرسہ ناصریہ'' باقاعدہ سرکاری سطح پر قائم ہوئے اور یہ روایت تیز رفتاری سے آگے بڑھتی رہی یہاں تک کہ تغلق عہد میں پہنچتے پہنچتے صرف دہلی میں ایک ہزار مدراس قائم ہو چکے تھے۔ جہاں عربی زبان ،منقول اور معقول پر مشتمل نصاب پڑھایا جاتا تھا،غیاث الدین بلبن دور میں علماء کی بہت بڑی تعداد جن کو فقہ،اصول،اور عربیہ پر دسترس حاصل تھی درس وتدریس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھی

آٹھویں صدی عیسوی میں تصوف کا رجحان بہت بڑھ اا تنا کہ تصوف دینی تعلیم کا ایک جزو بن گیا لیکن صوفیائے کرام نے بھی عربی زبان کی تدریس کو اہمیت دی نظام الدین الاولیاء نے شمس الدین الخوارزمی سے عربی زبان کا علم حاصل کیا اور مقامات حریری حفظ کی۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ ان کے مشہور شاگرد گزرے ہیں اور ان کے تین شاگرد ایسے ہیں جن کو عربی شعرو ادب میں کمال حاصل تھا وہ سید محمد گیسودرازؒ، قاضی عبدالمقتدر، احمد تھانیسری ہیں۔

یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ مسلمان دنیا بھر میں جہاں جہاں پہنچے اپنے ساتھ قرآن وحدیث کے علوم بھی وہاں منتقل کیے ان علوم کی نشرواشاعت کے لیے مسلمانوں کے ساتھ مبلغین اسلام یعنی مفسرین وائمہ کی اچھی خاصی تعداد ان کے ہمراہ ہوا کرتی تھی جنھوں نے مساجد کو اول اول اپنی دینی سرگرمیوں کے مراکز مقرر کیے پھر ان کے برابر ہی مدرسوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔

''دیبل کا شہر سندھ میں محدثین اور رواۃ کا سب سے پہلا اور سب سے اہم مرکز تھا اور اس بارے میں یہ منصورہ سے بہت آگے تھا۔ یہاں کے علماء خاص طور سے پورے عالم اسلام سے تعلق رکھتے تھے اور ہر ملک میں ان کی آمد و رفت جاری تھی یاقوت حموی کا بیان دیبل کے بارے میں گزر چکا ہے کہ شہر دیبل کی جانب راویوں کی ایک جماعت منسوب ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سندھ کا یہ شہر احادیث رسول کا شہر تھا اور یہاں احادیث کی تعلیم و روایت عام تھی۔'' [۷۲]

''اس دور میں علم حدیث کے اعاظم یہاں موجود تھے جن کا فیض اندر باہر ہر ہر جگہ عام تھا، یہاں کا ہر بڑا شہر علم وعلماء کا مرکز تھا اور اس میں حدیث کی روایت ہورہی تھی، منصورہ ، ملتان، لاہور، قندار، بامیان، دیبل، وغیرہ اس کے خصوصی مرکز تھے اور ان میں رواۃ حدیث اور اجلہ علماء رہتے تھے اور درس و روایت حدیث کا سلسلہ جاری تھا۔'' [۷۳]

یہ سلسلہ مدارس کے قیام سے بہت تیزی سے آگے بڑھا خصوصا عربی زبان کی تعلیم کے سلسلے میں مدارس نے بہت عمدہ کردار ادا کیا۔

''شیخ عبدالحق محدث کے دور سے عربیہ، منقول اور معقول میں امتزاج وتوازن کی راہ ہموار ہوئی، تآنکہ نظام الدین سہالوی (م۔۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ) نیا یک مقبول عام نصاب تعلیم کو آخری شکل دی جو انہیں کے نام پر درس نظامی کہلایا۔ درس نظامی گیارہ مادہ تدریس پر مشتمل تھا (۱) صرف ونحو (۲) بلاغت (۳) تفسیر (۴) حدیث (۵) فقہ (۶) اصول الفقہ (۷) منطق (۸) حکمت (۹) ریاضی وہیئت (۱۰) کلام (۱۱) مناظرہ۔ فارسی کی حیثیت اس میں ایک ابتدائی ضمنی مضمون سے زیادہ

نہیں تھی اور کسی دوسری مقامی یا اجنبی زبان کے لئے بحیثیت مادہ تدریس کوئی جگہ نہیں تھی۔[۷۴]

انگریزوں کی آمد تک درس نظامی تھوڑی بہت ترمیموں کے ساتھ سارے ملک میں رائج رہا اس میں صرف ونحو پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا جبکہ عربی ادب پر توجہ نہ ہونے کے برابر تھی انگریزی حکومت نے اس نظام کو تقریبا برقرار رکھتے ہوئے ۱۷۸۱ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ قائم کیا جس میں عربی ادب کا خاصا بڑا حصہ شامل کیا گیا۔ درس نظامی میں حدیث کا حصہ کلام منطق، ریاضی اور حکمت کے مقابلے میں کافی کم تھا جس میں دارالعلوم دیوبند کے قیام سے وسعت پیدا ہوئی۔ انیسویں صدی کے اختتام پر ندوہ العلماء کا قیام عمل میں آیا جس کے ذریعے عربی ادب کی تعلیم وتدریس میں بہت وسعت پیدا ہوئی۔ لیکن انگریزوں کے نئے نظام تعلیم سے جو کہ ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے کے ذریعے نافذ ہوا عربی زبان محض ایک مادہ تدریس کے طور پر شامل کردی گئی۔

تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند میں ہے،

''انگریز نے جو نیا نظام رائج کیا تھا اس میں مسلمانوں کی قدیم سرکاری زبان کو یک قلم موقوف کردیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے فقہی علوم کو از کار رفتہ قرار دے کر اسلامی علوم کی ان درسگاہوں کو جو کبھی قاضی القضاۃ، سپہ سالاران لشکر اور وزرائے سلطنت کو جنم دیتی تھیں اب بالکل بیکار کردیا گیا، اب ان عظیم درسگاہوں میں صرف مساجد کے ائمہ تیار ہونے لگے۔ جن مدارس میں عربی زبان کی تعلیم حاصل کرنے والوں کے ہجوم ہوا کرتے تھے اب وہ ویران ہوگئے۔''[۷۵]

یہاں چند درسگاہوں کا ذکر ضروری ہے جن بدولت قرآن وحدیث کی زبان کو برصغیر میں پھلنے پھولنے اور زندہ رہنے میں مدد ملی۔ ان درسگاہوں میں جو تقسیم ہند سے قبل موجود تھیں اور جن کے اس خطے پر اثرات بھی مرتب ہوئے، قابل ذکر یہ ہیں:

فرنگی محل کا مدرسہ: یہ مدرسہ اورنگ زیب عالمگیر کی عطا کردہ زمین پر ملا نظام الدین نے قائم کیا تھا۔

مدرسہ عربیہ مظاہر العلوم: مدرسہ عربیہ مظاہر العلوم سہارنپور کی بنیاد ۱۸۶۶ء/۱۲۸۲ھ کے ماہ رجب میں پڑی۔ اس درس گاہ کی علوم اسلامیہ کی اشاعت میں بڑا کردار ہے۔

دارالعلوم دیوبند: ایک اور معروف درسگاہ دارالعلوم دیوبند ہے، یہاں ادب عربیہ کو بڑی اہمیت دی گئی۔ نظم ونثر کے معیاری نمونے دخل نصاب ہوئے۔

دارالعلوم نعمانیہ: لاہور کی قدیم درسگاہوں میں ''دارالعلوم نعمانیہ کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔۱۸۷۸ء/۱۳۰۵ھ میں مولوی خلیفہ تاج الدین ،حکیم سلیم اللہ اور منشی سراج الدین وغیرہ نے انجمن نعمانیہ قائم کی ،جس کا مقصد عربی وعلوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت تھا اس انجمن کے پاس عربی کتابوں کا ایک بہترین ذخیرہ تھا۔

جامعہ بنوریہ کراچی: عربی زبان کے ایک مایہ ناز فاضل مولانا محمد یوسف بنوری ہیں جامعہ بنوریہ کراچی ،ان کے نام سے منسوب ہے۔آپ نے کراچی میں مجلس علمی کے نام سے ادارہ قائم کیا جس کا مقصد عربی ادب اور اسلامی علوم کی اشاعت ہے [۷۶]۔

عربی زبان کی ترعویج واشاعت میں دور جدید کی چند نامور شخصیات کی خدمات سنہری حرفوں سے لکھنے کی حقدار ہیں، ان میں مولانا فضل الحق خیرآبادی ،شاہ عبدالحق دہلوی ،مولان عبدالحق فرنگی محلی لکھنوی ،فیض الحسن سہارنپوری ،نواب صدیق حسن خان بہادر قنوجی ،مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی ،مولانا محمود الحسن بن ذوالفقار علی دیوبندی ،مفتی محمد عبداللہ ٹونکی ،مولانا احمد رضا خان بریلوی ، سید انورش کشمیری ،مولانا ابو عبداللہ محمد سورتی ، مولانا اشرف علی تھانوی ،مولانا محمد الیاس کاندہلوی ،مولانا شبیر احمد عثمانی ،مولانا اصغر روحی ،مولانا حسین احمد مدنی ،محمد یوسف دہلوی ،مولانا عبدالعزیز میمن مولانا نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ

حرف آخر:

اس مقالے کا مقصد یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں اسلام اور مسلمانوں کی اہم اور بنیادی زبان کی نشو ونما اور ترویج و اشاعت کا ایک مختصر جائزہ لیا جائے جو کہ پوری امت مسلمہ کو ایک زبان پر متحد کرتی ہے اور اتحاد بین المسلمین میں کلیدی کردار کی حامل زبان ہے۔تاہم اسکی کی ایک طویل تاریخ ہے جس کا تفصیلی طور پر تجزیہ کرنے کی بے حد ضرورت ہے تا کہ اس سلسلے میں ہونے والی کوتاہیوں اور صرف نظر کا تدارک کر کے نئے سرے سے اس زبان کو پروان چڑھانے کی کوشش کی جائے کیونکہ عربی زبان نہ صرف دین اسلام کو سمجھنے اس کی ترویج واشاعت کے لیے بلکہ عصر حاضر میں اتحاد امت کے لئے انتہائی اہم ستون ہے جس کو مزید نظر انداز کرنا سنگین غلطی کے مترادف ہوگا۔

حواشی وحوالہ جات:

[ا]۔ حركة التاليف باللغة العربية فى الاقليم الشمالي الهندي ،الدكتور جميل احمد ،وزارة الثقافة و الارشاد القومي .۱۹۷۷ م ، ص:٦

[۲]۔ تاریخ ادب اردو ، ڈاکٹر جمیل جالبی ، حصہ اول، مجلس ترقی ادب لاہور، ص:۸

[۳] تاریخ اردو زبان، ڈاکٹر مسعود حسن خان، اردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۶ء۔ص۴۴

[۴] ایضاً، ص۴۴

[۵] ایضاً، ص۱۱۱

[٦]۔ والمسالک والممالک لابن اسحاق ابراهيم الفارسى الاصطخرى ،تحقيق الدكتور محمد جابر الحسينى ،وبنشر وزراة الثقافة والارشادالجمورية العربية المصرية ، ۱۳۸۱/۱۹٦۱م ص:۱۰۵

[۷]. المتانةفى مرمة الخزانةالمخدوم محمد جعفر ابن العلامه المخدوم الكريم عبدالكريم ميران البوكانى السندى اللجنة الاضياء الادب السندى،

[۸]۔ عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ، ڈاکٹر زبید احمد، ترجمہ، شاہد حسین رزاقی، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۔ص:۲

[۹]۔ علماء ہند کا شاندار ماضی حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب، جلد اول، مکتبہ محمودیہ لاہور، سال اشاعت ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء ص:۳۷

[۱۰]۔ جامع اردو انسائیکلوپیڈیا جلد اول، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند، ویسٹ بلاک ا، آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی ۱۱۰٦

[۱۱]۔ علماء ہند کا شاندار ماضی، حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب، جلد اول، مکتبہ محمودیہ لاہور، سال اشاعت ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء ص:۳۰

[۱۲]۔ ایضاً۔ص:۳۱

[۱۳]۔ ایضاً۔ص:۳۲

[۱۴] ایضاً

[۱۵]۔ ایضاً

[۱٦]۔ کیفیہ، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۴۲ء ص:۱۰٦۔۱۰۷

[۱۷]۔ اعتصام الدولتہ، میرزا کلب حسین خان بہادر نادر، ڈاکٹر معزز قیصر، نظامی پریس لکھنو، سال اشاعت ۱۹۸۳ء ص:۲۹

[۱۸]۔ ایضاً ص:۱۵۱

[۱۹]۔ ایضاً

[۲۰]۔ کیفیہ۔ص:۱۱۰

[۲۱]۔ ایضاً ص:۱۱۳

[۲۲]۔ ایضاً۔ص:۱۱۴

[۲۳]۔ ایضاً۔ص:۱۹۹

[۲۴]۔ اردو شعر کی داستان، (دکن کے دبستان سے ساحل گجرات تک کے حالات کا تفصیلی جائزہ) مولف۔اے حمید مطبوعات شیخ غلام علی ، ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور، ص:۱۴

[۲۵]۔ تاریخ ادب اردو، جلد اول، ص:۱۰۹

۲٦]۔ سندھیوں، عبدالجبار جونیجو، انسٹیوٹ آف سندھیالوجی، جامشورو، ۱۹۸۳، ص:٦۳

[۲۷]۔ ایضاً۔ص:٦۴

[۲۸۔ عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ، ص:٦۲

[۲۹]۔ عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ۔ص:٦۳۔٦۴

[۳۰]۔ عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ۔ص:۹۲

[۳۱]۔ عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ، ص:۹۷

[۳۲]۔ ابوالحسن علی بن حسین علی المسعودی، ترجمہ: مولانا عبداللہ العمادی، التبینہ والاشراف سعید کمپنی، ادب منزل پاکستان چوک کراچی، اکتوبر ۱۹٦۷ ص:۱۴۔۱۵

[۳۳]۔ عربی ادبیات میں برصغیر پاک و ہند کا حصہ: ص:۱۸۔۱۹

[۳۴]۔ دہلی کا نظم حکومت، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ترجمہ: ہلال احمد زبیری، کراچی یونیورسٹی پریس، اشاعت سوئم، سال اشاعت، ۲۰۰۰ء، ص: ۱۹۷

[۳۵]۔ عربی ادبیات میں برصغیر پاک و ہند کا حصہ۔ ص: ۲۲

[۳۶]۔ عربی ادبیات میں برصغیر پاک و ہند کا حصہ، ص: ۵۸

[۳۷]۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر تاریخ ادب اردو، جلد چہارم، مجلس ترقی ادب، لاہور سن اشاعت، ۲۰۱۲، ص: ۱۰۰

[۳۸]۔ ایضاً۔ ص: ۱۰۱

[۳۹]۔ دیوان غالب کامل، تاریخی ترتیب کے ساتھ، مرتبہ: کالی داس گپتا، انجمن ترقی اُردو، پاکستان، ۱۹۵۷ء ص: ۳۳۹۔۳۴۰

[۴۰]۔ ایضاً۔ ص: ۳۴۶

[۴۱]۔ ایضاً۔ ص: ۳۴۷

[۴۲]۔ ایضاً۔ ص: ۲۵۶

[۴۳]۔ ایضاً۔ ص: ۳۰۴

[۴۴]۔ نیا اور پرانا اردو ادب، ڈاکٹر فرمان فتح پوری ، قمر کتاب گھر کراچی ۱۹۷۴ء ص: ۱۸۰

[۴۵]۔ ماہنامہ فنون مدیر احمد ندیم قاسمی، دسمبر، جلد: ۲۰ شمارہ: ۱ مقام اشاعت: ۴۷۔ انارکلی لاہور ص: ۸۸۔۸۹

[۴۶]۔ اردو ادب کے تحریکیں، ڈاکٹر انور سدید، انجمن ترقی اردو، اشاعت پنجم۔ ۲۰۰۴ء ص: ۲۱۸

[۴۷]۔ انشاءاللہ خان انشاء، رانی کیتکی کی کہانی، انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۳ء ص: ۴۷

[۴۸]۔ اردو ادب کی تحریکیں۔ ص: ۲۸۷

[۴۹]۔ خلافت امویہ اور ہندوستان، قاضی اطہر مبارکپوری، تنظیم فکر و نظر سندھ، اپریل ۱۹۸۶ء، ص: ۲۷۵

[۵۰]۔ خلافت امویہ اور ہندوستان، ص: ۲۷۷

[۵۱] ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، قاضی اطہر مبارکپوری،، تنظیم فکر و نظر سندھ، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۲۸

[۵۲] فتوح البلدان ، ابو الحسن احمد بن یحیی بن داود بلاذری ، مصر ، ص: ۴۳۱

[۵۳] فتوح البلدان ، ص: ۴۲۵

[۵۴] ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ص: ۱۳۰

[۵۵] ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں،ص:۱۶۴

[۵۶] فتوح البلدان ، ابوالحسن احمد بن یحیی بن داود بلاذری ، مصر ،ص: ۴۳۲

[۵۷] خلافت امویہ اور ہندوستان،ص:۲۸۴

[۵۸] خلافت امویہ اور ہندوستان،ص:۲۰۰

[۵۹] ایضاً،ص:۲۰۱

[۶۰] ایضاً،ص:۴۰۹

[۶۱] خلافت عباسیہ اور ہندوستان، مصنف: قاضی اطہر مبارکپوری،فکرونظر پبلیکیشنز ،سندھ اسلامک سینٹر سکھر ص:۱۶۵

[۶۲] خلافت عباسیہ اور ہندوستان،ص:۳۶۰

[۶۳] خلافت عباسیہ اور ہندوستان،ص:۳۶۲

[۶۴] خلافت عباسیہ اور ہندوستان،ص ۳۷۸

[۶۵] ایضا ۳۸۰

[۶۶] ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں،ص:۸۷

[۶۷] ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں،ص:۸۷

[۶۸] مسالک الممالک،ص:۱۷۳

[۶۹] فتوح البلدان ۴۲۹

[۷۰] خلافت عباسیہ اور ہندوستان،ص:۲۰۰

[۷۱] خلافت امویہ اور ہندوستان،ص:۳۴۵

[۷۲] ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں،ص:۱۵۹

[۷۳] خلافت عباسیہ اور ہندوستان،ص:۴۵۰

[۷۴] تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، مدیران خصوصی؛سید فیاض محمود و پروفیسر، دوسری جلد، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ص:۱۵

[۷۵] ایضاً،ص:۳۹۵

اسلام اور مغرب کے مابین تہذیبی تصادم کی حقیقت مولانا مودودیؒ کے افکار کی روشنی میں ایک تحقیقی مطالعہ

☆ آسیہ عمران

موجودہ دور اور عالمی سطح پر تہذیبی تصادم کا دور ہے۔ مختلف نظاموں اصولوں اور نظریات اور ثقافتوں میں کئی انداز سے کشمکش نظر آتی ہے۔ یہ کشمکش میں انسانیت کے لئے لا متناہی خطرات پیدا کر رہی ہے۔ اس وقت عالمی سطح پر دیکھیں تو مختلف تہذیبیں نظر آتی ہیں مغرب جو اس وقت کی سپر پاور ہے۔ انسانی عقل و تجربہ کی بنیاد پر عالمی تہذیب کی تشکیل نو کرنا چاہتا ہے۔ مغرب کے نزدیک دنیا کی اصل حقیقت طاقت اور غلبہ حاصل کرنا ہے۔ اور اس کے حصول کی جدوجہد نیکی ہے چاہے وہ دنیائے انسانیت کے لیے تباہی کا باعث ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا دہشت گردی، استحصال، پروپیگنڈا، سازشیں ہر طرح کی بموں کا استعمال سب جائز ہی نہیں ضروری بھی ہیں۔ مغرب کے اس نظریے نے دنیا کو عملاً میدان جنگ بنا دیا ہے۔

قانون قدرت ہے کہ جب کوئی تہذیب انسانیت کے لیے باعث طمانیت نہ ہو وہ ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ وہ تہذیب لیتی ہے۔ جو انسانیت کی فلاح کے کام کرتی ہو۔ اس وقت تہذیبی تصادم کی اصطلاح دنیا میں خاص طور پر مغرب میں معروف ہو رہی ہے وہ بھی خاص طور پر اسلام کے مقابلے میں دشمن جس امت کو بیمار اور بیکار سمجھ کر اسے دفنانے کے انتظامات کر رہا تھا۔ اب وہ عالمی خطرے کے طور پر جانی جا رہی ہے۔ اور وہ مغرب جو اپنے خوابوں کی بلندی کے سفر پر تھا۔ اسے تہذیبوں کے تصادم کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ مولانا مودودیؒ کا معاصر اسلامی تحریک میں نمایاں مقام ہے۔ احیائے اسلام کی تحریکوں پر یلغار کرنے والے حلقے عالم اسلام کی جن شخصیات کو بحث کا مرکز بنا رہے ہیں۔ ان میں مولانا مودودیؒ سرفہرست ہیں دوسری

☆ ریسرچ اسکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، کراچی یونیورسٹی

طرف اسلام کے بہی خواہ مولانا مودودیؒ کی خدمات پر ان کے ممنون دکھائی دیتے ہیں۔ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مولانا مودودیؒ کے "تہذیبی تصادم" کے بارے میں افکار کا جائزہ لیا جائے۔

تہذیبی تصادم کی حقیقت:

مغرب میں اس وقت تہذیبی تصادم کی اصطلاح جن معنوں میں استعمال کی جا رہی ہے۔وہ یہ ہے کہ اسلام ان کی بقا کے لیے خطرہ ہے جب کہ مولانا مودودیؒ کے نزدیک بنیادی نقطہ دونوں تہذیبوں کی اصل سے متعلق ہے۔کہ دونوں تہذیبیں ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

مولانا صاحب اسلام اور مغرب کے فرق کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"اسلام اور مغربی تہذیب دو ایسی کشتیاں ہیں جو بالکل مخالف سمتوں میں سفر کر رہی ہیں جو شخص ان میں سے کسی ایک کشتی میں سوار ہوگا اسے لامحالہ دوسری کشتی کو چھوڑنا پڑے گا اور جو بیک وقت دونوں کشتیوں پر سوار ہوگا اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے"۔(1)

مولانا مودودیؒ دونوں تہذیبوں کے نظریات کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیتے ہیں کہ ان میں سے ایک روحانیت کا علم بردار ہے تو دوسرا خالص مادیت کا مغرب کا سابقہ دنیا میں جن اقوام کے ساتھ ہوا ان میں ایک تو وہ تھیں جن کے پاس مکمل ضابطہ حیات موجود نہ تھا۔کوئی مضبوط تہذیب نہ تھی نتیجے میں وہ مغرب کے رنگ میں رنگتی چلی گئیں۔یہاں تک کہ ان کے پاس کوئی بھی منفرد قدر باقی نہ رہی۔یعنی مغرب کا ان سے ایسا تصادم نہیں ہوا کہ مغرب کو اپنی تہذیب کی بقا خطرے میں نظر آئی۔باقی اقوام کے مقابلے میں اسلام کا معاملہ مختلف رہا۔اسلام کی اپنی مضبوط تہذیب تھی مکمل ضابطہ حیات تھا،اقتدار تھیں، جو فکری و عملی لحاظ سے مستقل زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط تھیں لہٰذا مغرب کا سامنا جب اسلام سے ہوا تو اسے اپنی بقا کے خطرے کا سامنا کرنا پڑا اس کے متعلق مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں۔

"مغربی تہذیب کی اساسی اصول کلیتاً اس تہذیب کے مخالف واقع ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ قدم قدم پر دونوں تہذیبیں آپس میں ٹکرا رہی ہیں اور ان کے تصادم سے مسلمانوں کی اقتصادی اور عملی زندگی کے ہر شعبے پر تباہ کن اثر پڑ رہا ہے"(2)

حق اور باطل میں فطری طور پر علیحدگی ہے۔یا حق ہوگا یا باطل دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔یعنی ان میں مفاہمت نہیں ہو سکتی نہ ہی ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ شیر و شکم ہو سکتے ہیں۔مولانا مودودیؒ الجہاد فی الاسلام میں فرماتے ہیں۔

"حق اور باطل کے درمیان پوری حد بندی کر دی گئی ہے۔ جو لوگ ظلم و سرکشی کی راہ سے جنگ کریں وہ شیطان کے دوست ہیں جو ظلم کو مٹانے کے لیے جنگ کریں۔ وہ حق پر ہیں حق یکتائی پسند ہے۔ وہ باطل کو اپنا شریک بنا کر کبھی ایسی تقسیم کر سکتا کہ آدھا تیرا اور آدھا میرا"(3)

اس وقت دنیائے اسلام میں بیداری کی جو لہر اٹھی ہے اسے تصور کرتے ہوئے مغربی اخبارات کی شہہ سرخیاں اور مضامین کچھ اس طرح کے ہیں "وہ اب بھی صلیبی جنگ لڑ رہے ہیں"۔ "نیا ہلال بحران میں"، "عالمی انتفاضہ"، "ابھرتا ہوا اسلام مغرب پر غلبہ پالے گا"، "مسلمانوں کے غم و غصہ کی جڑیں"، "حدیث کے خلاف اسلام کی جنگ"، اور "عظیم ترین بحران"(4)

جان ایل ایسپوزیٹو کی یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ایسے مضامین عربوں اور اسلام کے بارے میں حیران کن حد تک لاعلمی میں مخالفت پر مبنی روایتی پروپیگنڈا اور ان کی بغاوت کے بارے میں خیالات کو دہرانے کے مترادف ہے۔ اس کے نزدیک یہ مبالغہ آمیز اصطلاحات اور جملے اسلام کی فطرت کو بگاڑ کر پیش کرتے ہیں اور یہ اس مذہب کی بوقلمونی کو نظر انداز کرنے کی کوشش ہے۔(5)

مولانا مودودیؒ اس صورتحال کو مختلف انداز سے دیکھتے ہیں۔ ترجمان القرآن کہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"اب اسلام اور مغربی تہذیب کا تصادم ایک دوسرے کی ڈھنگ پر ہو رہا ہے۔ یقیناً مغربی تہذیب کسی حیثیت سے بھی اسلام کے مقابلے کی تہذیب نہیں اگر تصادم اسلام سے ہو تو دنیا کی کوئی قوت اس کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی مگر اسلام سے کہاں؟ مسلمانوں میں نہ اسلامی سیرت ہے، نہ اسلامی اخلاق، نہ اسلامی اسکالر ہیں، نہ اسلامی جذبہ، عملی زندگی سے اسلام کا ربط باقی نہیں رہا۔۔۔ ایسی حالت میں دراصل مقابلہ اسلام اور مغربی تہذیب کا نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی افسردہ جامد اور پسماندہ تہذیب کا ایک ایسی تہذیب سے ہے۔ جس میں زندگی، حرکت، روشنی علم، گرمی عمل ہے"۔(6)

مجدد الف ثانی سے اب تک مولانا مودودیؒ اور محمد حسن عسکری تک ہمارے سامنے بڑے لوگ وہ ہیں۔ جنہوں نے اسلامی تہذیب کی انفرادیت اور دوسری تہذیبوں سے اس کی عدم مطابقت ثابت کی ہے۔ اور اس پر زور دیا ہے۔(7)

اسلام اور مغربی تہذیب کے مقاصد اور تنظیم معاشرت کے اصولوں میں زمین و آسمان کا بعد ہے۔(8)

اسلام اہل مغرب کے تصور کے مطابق محدود معنوں میں کوئی ذاتی معاملہ نہیں بلکہ ایک مکمل نظام حیات ہے۔(9)

مولانا مودودیؒ مغربی فلسفہ حیات کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"معلومات وحقائق کو جمع کر کے جو فلسفہ حیات اہل مغرب نے بنایا ہے۔ وہ قطعی باطل ہے۔ ان کو مرتب کر کے جو طرز فکر اور کائنات کے متعلق جو تصور اور انسان کے بارے میں جو خیال انہوں نے قائم کیا ہے اور جس کے اوپر پوری تہذیب کی عمارت انہوں نے اٹھائی ہے وہ ساری کی ساری از اول تا آخر باطل ہے جو معاشرتی علوم انہوں نے مرتب کئے ہیں اور جو معاشرتی فلسفہ انہوں نے گھڑا ہے وہ موجب فتنہ وفساد ہے۔ وہ انسان کی فلاح کے لئے نہیں بلکہ تباہی کے لئے ہے"۔(10)

دوسری طرف اسلام کی رہنمائی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"حقیقت کی تلاش اور اس کی تڑپ انسان کی فطرت میں موجود ہے وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔مگر تلاش حقیقت کے مختلف راستوں میں صحیح راستہ ہمارے نزدیک وہ ہے جو انبیاء کرام کا ہے۔ لہٰذا اس فلسفہ حیات پر نظامِ تعلیم کی تشکیل ضروری ہے جو سراسر کامیابی کا راستہ ہے"۔(11)

تصادم کا پس منظر:۔

اسلام کے ساتھ مغرب کے تصادم کو دیکھنا ہو تو اس کا اولین پس منظر جاننا ہوگا۔مغربی تہذیب نے مذہب اور عقل کے ٹکراؤ سے جنم لیا۔ دراصل جب مسلمانوں کے زیر اثر یورپ میں علمی تحریک اٹھی۔تو وہاں کے عیسائی پادریوں نے اسکی مخالفت کی۔اور اس کو روکنے کے لئے سزائیں دی گئیں۔لیکن یہ تحریک بجائے دبنے کے اتنی بڑھی کہ اس نے کلیسائی اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔مولانا مودودیؒ اس ٹکراؤ کے اثرات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"ابتداء میں لڑائی حریت فکر کے علمبرداروں اور کلیسا کے درمیان تھی۔مگر چونکہ کلیسا مذہب کے نام پر آزاد خیالوں سے جنگ کر رہا تھا۔اس لئے بہت جلد اس لڑائی نے مسیحی مذہب اور آزاد خیالی کے درمیان جنگ کی صورت اختیار کر لی۔اس کے بعد نفس مذہب اس تحریک کا مدمقابل قرار دیا گیا۔۔۔۔لہٰذا نئے دور کے اہل حکمت وفلسفہ میں روحانیت اور فوق الطبیعت کے خلاف ایک تعصب پیدا ہوگیا۔جو عقل واستدلال کا نتیجہ نہ تھا بلکہ سراسر جذبات کی برانگیختگی کا نتیجہ تھا۔وہ خدا سے اس لئے تبرّی نہ کرتے تھے کہ دلائل اور براہین سے اس کا عدم وجود اور عدم وجوب ثابت ہو گیا تھا۔ بلکہ اس لئے بیزار تھے کہ وہ ان کے اور انکی آزاد خیالی کے دشمنوں کا معبود تھا"۔(12)

یہی وجہ کہ اسلام کے تصورات مغربی تعصب کے پردے میں چھپ گئے۔مولانا مودودیؒ نے اسلام اور مغرب کے تصورات کے فرق کو کھول کر بیان کیا ہے۔

اسلام میں مذہب زندگی کا قانون ہے۔مغرب میں مذہب ایک شخصی اعتقاد ہے۔جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں اسلام میں پہلی چیز ایمان باللہ جبکہ وہاں سرے سے اللہ کا وجود ہی مسلم نہیں اسلام کا پورا نظام وحی ورسالت کے اعتقاد پر قائم ہے۔وہاں وحی کی حقیقت میں شک ہے۔وہاں وحی کی حقیقت اور رسالت من جانب اللہ ہونے میں شک ہے،اسلام میں آخرت کا اعتقاد پورے نظام اخلاق کا سنگ بنیاد ہے۔اور وہاں یہ بنیاد خود بے بنیاد نظر آتی ہے۔اسلام میں جو عبادات اور اعمال فرض ہیں وہاں وہ محض عہد جاہلیت کے رسوم ہیں۔جن کا اب کوئی فائدہ نہیں۔(13)

مولانا مودودیؒ جدید مغربی تہذیب کو جاہلیت خالصہ،باطل،تخم خبیث اور شجر خبیث کہتے ہیں۔(14)

جس طرح مولانا مودودیؒ نے اسلام اور مغرب کے تصورات کے اختلاف کو واضح کیا ہے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ اسلام کے اصول تمدن وتہذیب بھی مغربی تہذیب وتمدن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

قانون میں اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ خود خدا واضح قانون ہے،رسول شارح قانون اور انسان صرف متبع قانون۔مگر وہاں خدا کو وضع قانون کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں۔لیجسلیچر واضح قانون ہے اور قوم لیجسلیچر کو منتخب کرنے والی ہے"۔(15)

تہذیبی تصادم کی نوعیت:-

مفکرین اسلام نے اسلام اور مغربی تہذیب کی کلی عدم مطابقت ثابت کی ہے۔کہ اسلام مکمل طور پر مغربی تہذیب سے الگ ہے۔اس کا بیج،اس کی جڑیں،تنا اور شاخیں سب سے الگ ہیں۔لہٰذا ان کا ملاپ دریا کے دو کناروں کی طرح ممکن نہیں۔مولانا مودودیؒ بھی دونوں تہذیبوں میں کلی تصادم کے قائل ہیں۔

"مغربی تہذیب کے اساسی اصول کلیۃ اس تہذیب کے مخالف واقع ہوئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ قدم قدم پر دونوں تہذیبیں آپس میں ٹکرا رہی ہیں۔اور ان کے تصادم سے مسلمانوں کی اعتقادی اور عملی زندگی کے ہر شعبے پر تباہ کن اثر پڑ رہا ہے"۔(16)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

"اس کا نظریہ اسلام کے نظریے کی بالکل ضد ہے۔اس کا راستہ اس راستے کے عین مخالف سمت میں ہے۔جو اسلام نے اختیار کیا ہے۔اسلام جن چیزوں پر انسانی اخلاق اور تمدن کی بنا رکھتا ہے ان کو یہ تہذیب بیخ وبن سے اکھاڑ دینا چاہتی

ہے۔اور یہ تہذیب جن بنیادوں پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی عمارت قائم کرتی ہے۔ان پر اسلام کی عمارت ایک لمحہ کے لئے نہیں ٹھہر سکتی"۔(17)

اسلام کے ساتھ مغربی تہذیب کا تصادم جن حالات میں پیش آیا ہے۔وہ ان حالات سے بالکل مختلف ہیں جن میں اس سے پہلے اسلام اور دوسری تہذیبوں کے درمیان تصادم ہوئے ہیں۔رومی فارسی، ہندی اور چینی تہذیبیں اس وقت اسلام سے ٹکرائیں جب اسلام نے اپنے متبعین کی فکری و عملی قوتوں پر پورے زور کے ساتھ حکمران تھا۔جہاد اور اجتہاد کی زبردست روح ان کے اندر کارفرما تھی۔روحانی اور مادی دونوں حیثیتوں سے وہ دنیا میں ایک غالب قوم تھے۔اور تمام اقوام عالم کی پیشوائی کا منصب ان کو حاصل تھا۔اس وقت کوئی تہذیب ان کی تہذیب کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکی۔انہوں نے جس طرف رخ کیا۔قوموں کے حالات،نظریات،علوم،اخلاق و عادت اور طرز تمدن کا مزاج اتنا طاقتور اور مضبوط تھا کہ باہر سے جو چیز بھی اس میں آئی وہ اس طبعیت کے مطابق ڈھل گئی۔اور کسی بیرونی اثر سے سوئے مزاج مختلف پیدا نہ ہوسکا۔ بخلاف اس کے اس نے جو اثرات دوسروں پر ڈالے وہ انقلاب انگیز ثابت ہوئے۔بعض غیر مسلم تہذیبیں تو اسلام میں جذب ہو کر اپنی انفرادیت ہی کھو بیٹھیں۔اور بعض جن میں طاقت تھی وہ اسلام سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ ان کے اصولوں میں بہت کچھ متغیر ہوگیا۔(18)

اسلام اور مغرب کے مابین بنیادی امتیازات:-

دنیا کی کوئی بھی تہذیب ہو چار تصورات ایسے ہیں جنہیں وہ نظر انداز نہیں کرسکتی۔ان چاروں تصورات کے حوالے سے اسلام اور مغربی تہذیب میں کیا فرق ہے۔مولانا مودودیؒ کے افکار کی روشنی میں دیکھتے ہیں:

1-الٰہیات:-

دنیا کی کوئی بھی تہذیب اللہ کے تصور سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔یہاں تک کہ وہ تہذیب جو خدا کو نہ ماننے کا دعویٰ کرتی ہے ان کا نہ ماننا بھی ایک عقیدہ ایک الٰہیات ہے۔مولانا مودودیؒ اسلام اور مغرب کے الٰہیات میں فرق کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اسلام میں پہلی چیز ایمان باللہ ہے۔مغرب میں اللہ کا وجود ہی مسلم نہیں۔اسلام کا رخ بین الاقوامیت کی طرف ہے اور مغرب کا کعبہ مقصود قومیت ہے"۔(19)

مغربی تہذیب درست تصورالہٰ کے ہٹنے سے جس گمراہی کا شکار ہوئی اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:-

"ان کی تہذیب اور ان کے تمدن کی اثاثے غلط ہوگئی وہ خدا کو چھوڑ کر خودی کی پرستار بن گئے۔ اور خودی نے خدا بن کر ان کو فتنے میں ڈال دیا۔ اب یہ اسی جھوٹے خدا کی بندگی ہے۔ جو فکر وعمل کے ہر میدان میں ان کو ہر فریب ہلاکت کی طرف لے جا رہی ہے۔(20)

اسلام کا پورا نظام تہذیب وحی و رسالت کے اعتقاد پر قائم ہے جبکہ مغرب میں مشاہدے، تجربے، قیاس و استقراء کے سوا کوئی چیز رہنما نہیں۔(21)

ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے مادیت کا استحکام بخشنے اور ایک مدلل اور منظّم عملی نظریے کی حیثیت دینے میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔(22)

مولانا مودودیؒ مذہبی نظریے کا بنیادی تخیل ایک طاقت کو قرار دیتے ہیں جو اس عالم سے بالاتر ہو۔ لیکن جدید تحریک کے علمبرداروں نے لازم سمجھا کہ خدا یا کسی مافوق الفطرت ہستی کو فرض کئے بغیر کائنات کے معمّے کو حاصل کریں۔ مغربی فلسفہ اور سائنس نے جب اپنا کام شروع کیا تو اگرچہ اس کا رخ خدا پرستی کے بالکل مخالف سمت میں تھا۔ مگر مذہبی ماحول میں گھرے ہونے کے سبب جب وہ نیچریت کو خدا پرستی کے ساتھ نبھاتے رہے۔ مگر جو وہ سفر میں آگے بڑھے نیچریت خدا پرستی پر غالب آئی۔(23)

2-تصور علم:-

کوئی بھی تہذیب ہو وہ یقینی اور حتمی علم کا تصور ضرور رکھتی ہے۔ اس تصور کا بنیادی سوال یہ ہے کہ یقین کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اور ہر تہذیب سوال کا جواب رکھتی ہے۔ اسلامی تہذیب کا جواب یہ ہے کہ یقینی علم کا سرچشمہ "وحی" ہے۔ اور مغربی تہذیب کا جواب "سائنس" ہے۔

مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:-

"توحید کا تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ اس سے اجتماعی زندگی کا پورا نظام جو انسان کی خودمختاری یا غیر اللہ کی حاکمیت والوہیت کی بنیاد پر بنا ہوا جڑ سے اکھڑ جاتا ہے۔ اور ایک دوسری اساس پر ایک نئی عمارت تیار ہوتی ہے آج دنیا یا آپ کے مؤذنوں کو اشهد ان لا اله الا الله کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لیے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا

ہے۔ کہ کیا پکار رہا ہوں نہ سننے والوں کوئی اس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر انہیں اس اعلان کا مقصد معلوم ہو جائے کہ اس کا مطلب کوئی حکومت، قانون، عدالت تسلیم نہیں کرنا۔ کسی کے امتیازی حقوق کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا۔ ایک اللہ کے سوا میں سب سے باغی سب سے منحرف ہوں۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا خود آپ سے لڑنے آجائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آنے کو محسوس ہوگا کہ یکا یک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں۔ اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں۔(24)

3-تصور کائنات:-

دنیا کی کوئی بھی تہذیب مؤثر کے اصول کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اس کے مطلب یہ ہے۔ ہر تہذیب کو اس سوال کا جواب دینا ہوتا ہے کہ زندگی اور کائنات کیسے وجود میں آئی۔ مولانا مودودیؒ کائنات کے تصور تخلیق کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"خدا محض خالق ہی نہیں آمر اور حاکم بھی ہے۔ عملاً تمام کائنات کی تدبیر خدا کے ہاتھ میں ہے۔ لیل و نہار کی گردش آپ سے آپ نہیں ہو رہی ہے بلکہ خدا کی قدرت سے ہو رہی ہے۔ جب چاہے اسے روک دے اور جب چاہے اس کے نظام کو تبدیل کر دے، سورج، چاند اور تارے خود کسی طاقت کے مالک نہیں ہیں بلکہ خدا کے ہاتھ میں بالکل مسخر ہیں۔ بس وہی کام کیے جا رہے ہیں جو خدا ان سے لے رہا ہے۔ جبکہ مغربی مفکرین کسی خالق کے قائل نہیں۔۔ ان کے نزدیک کائنات ایک دھماکے سے وجود میں آئی۔ اور سب کچھ خود بخود وجود میں آ گیا"۔(25)

اسلام نے مسلمانوں کو ایک مکمل ضابطہ زندگی دیا ہے۔ جو دوسرے ضوابط زندگی کی بالکل مختلف صورت پر نظام اجتماعی کی تشکیل کرتا ہے۔(26)

4-تصور فلاح:-

دنیا کی کوئی بھی تہذیب حتمی سبب یعنی بالآخر انسان کی ساری جدوجہد کا حاصل کیا؟ کا جواب ضرور دیتی ہے۔ یعنی انسان کی کامیابی اور ناکامی کا پیمانہ کسے کہا جائے۔ مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

"اس کا جواب اسلام نے دیا ہے الدنیا مزرعۃ الاٰخرۃ یعنی دنیا اور آخرت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی سلسلہ ہے۔ جس کی ابتدا دنیا اور انتہا آخرت ہے۔ ان دونوں میں وہی تعلق ہے۔ جو کھیتی اور فصل میں ہوتا

ہے۔۔۔۔۔دنیا ایک کھیتی ہے اس کھیتی میں آدمی کو اس لیے بھیجا گیا ہے کہ اپنی محنت اور اپنی کوشش سے اپنے لئے فصل تیار کرے۔خدا کی پیدائش سے لے کر موت تک کے لیے آدمی کو اس کام کی مہلت دی گئی ہے اس مہلت میں جیسی فصل آدمی نے تیار کی ہے ویسی ہی فصل وہ موت کے بعد دوسری زندگی میں کاٹے گا۔اور پھر جو فصل وہ کاٹے گا اسی پر آخرت کی زندگی میں اس کا گزر بسر ہوگا"۔(27)

یعنی یہ کہ اللہ رب العزت نے دنیا کی زندگی کے نتائج کے لیے آخرت رکھی ہے۔اگر دنیا کی زندگی ہدایت الٰہی کے مطابق بسر کی تو آخرت میں نجات ہوگی۔بصورت دیگر ہمیشگی کا عذاب۔

''خدا اور آخرت کو نظر انداز کر دینے کے بعد اخلاق کے لیے مادی قدروں کے سوا کوئی قدر اور تجربی بنیادوں کے سوا کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔ذاتی اور قومی منفعت کے لیے ہر اصول بنایا اور توڑا جا سکتا ہے آج تو خیر ہے کل شر ہو سکتا ہے''(28)

لہٰذا اس تصور نے مغرب اور اسلام میں نا قابل عبور فصیل کھڑی کر دی ہے۔

مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:-

"اخلاقیات میں اسلام کی پیش نظر آخرت کی کامیابی ہے اور مغرب کی پیش نظر دنیا کا فائدہ ہے (یعنی ترقی)"(29)

تصورات کا فرق:-

مولانا مودودیؒ نے اسلام اور مغربی تہذیب کے مابین کچھ بنیادی تصورات کو بھی واضح کیا۔مثلاً اسلام کا تصور یہ ہے کہ دین اور سیاست ایک ہے۔جب کہ مغرب دین و سیاست کی تفریق کا قائل ہے۔مغرب کے زیر اثر مسلمانوں کے اس تصور کی تبدیلی کے متعلق فرماتے ہیں:-

"حقیقت یہ ہے کہ علماء کی اکثریت یا تو قلت فہم یا کم ہمتی کے سبب سے دین و دنیا کی تقسیم پر راضی ہو چکی ہے۔جس کا تخیل اب سے مدتوں پہلے عیسائیوں سے مسلمانوں کے ہاں درآمد ہوا تھا۔انہوں نے چاہے نظری طور پر اسے پوری طرح نہ مانا ہو۔مگر عملاً وہ اسے تسلیم کر چکے ہیں۔سیاسی اقتدار اور دنیوی ریاست و قیادت غیر اہل دین کے ہاتھ میں رہے۔چاہے یہ محدود دنیا بے دین سیاست و قیادت کے مسلسل تاخت سے روز بروز سکڑ کر کتنی ہی محدود ہوتی چلی جائے"۔(30)

مغربی تہذیب اور اسلام میں عقل کے مقام میں فرق ہے وہ اس بارے میں اپنے نظریات بیان کرتے ہیں "جہاں تک عقلی استدلال کا تعلق ہے وہ ہم کو صرف "ہونا چاہیئے" کی حد تک لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔اب رہا یہ سوال کہ آیا واقعی کوئی

ایسا علم ہے بھی جو تو ہماری عقل اور ہمارا علم دونوں اس کے حکم لگانے سے عاجز ہیں۔ یہاں قرآن ہماری مدد کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل اور فطرت جس چیز کا مطالبہ کرتی ہے۔ فی الواقع وہ ہونے والی ہے۔ موجودہ نظام عالم جو طبعی قوانین پر بنا ہے۔ ایک وقت میں توڑ ڈالا جائے گا اس کے بعد ایک دوسرا نظام بنے گا۔ جس میں زمین و آسمان اور ساری چیزیں ایک دوسرے ڈھنگ کی ہونگی"۔(31)

ایک اور تحریر ہے۔

"بجائے خود عقل اور قوت علمیہ میں کوئی شرف اور برتری نہیں ہے۔ یہ تو محض حصول شرکت کے لئے ایک آلہ ہے۔ اور اس آلے نے انسان کو یہ استعداد بہم پہنچادی ہے کہ اس سے ٹھیک ٹھیک کام لے کر وہ بندگی اضطراری کے میدانی مقام سے ترقی کر کے عبادت اختیاری کے انسانی مقام پر پہنچ سکے"۔(32)

تصور قومیت کے حوالے سے ان کی رائے ہے:

"ان کو صبر نہیں جو چیز مغربی قومیت کے لئے آب حیات ہے وہی چیز اسلامی قومیت کے لیے زہر۔ مغربی قومیتوں کی بنیاد نسل، وطن، اور زبان و رنگ کی وحدت پر قائم ہوتی ہے۔ ایک ہندی مسلمان مصر کا ویسا ہی وفادار شہری بن سکتا ہے جیسا کہ وہ خود ہندوستان کا ہے۔ اس لئے ایک ملک کے مسلمان اور دوسرے ملک کے مسلمان میں جغرافیائی یا نسلی تفریق کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس معاملے میں اسلام کے اصول اور مغرب کے اصول ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔ جو وہاں سبب قوت ہے وہ یہاں سبب ضعف ہے۔ اور جو یہاں مایہ حیات ہے وہ وہاں بعینہٖ سم قاتل ہے"۔(33)

درج بالا بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا مودودیؒ تہذیبی تصادم کے قائل نہیں بلکہ وہ اسے کلیت کی سطح پر بتاتے ہیں۔ دونوں تہذیبوں میں اسلام فطرت سے قریب تر جبکہ مغربی تہذیب کا رخ خلاف فطرت ہے۔ دونوں میں مفاہمت کی صورت یہ ہے کہ حق کو قبول کرنے کے لئے تعصب سے بالاتر ہو کر دیکھا جائے۔

مصادر و مراجع:

1- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، تنقیحات، ص18، ایڈیشن 1997ء۔
2- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، تنقیحات، ص11، ایڈیشن 1997ء۔
3- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، الجھاد فی الاسلام، ص45، ادارہ ترجمان القرآن، دسمبر 2009ء۔
4- جان ایل اسپوزیٹو، The Islamic threat, Myth or reality؟، ص45، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1992ء۔
5- جان ایل اسپوزیٹو، The Islamic threat, Myth or reality؟، ص5، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1992ء۔
6- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، تنقیحات، ص32، ایڈیشن ستمبر 2006ء۔
7- فاروقی، شاہ نواز، تہذیبوں کا تصادم، ص178، ادارہ مطبوعات طلبہ، ستمبر 2012ء۔
8- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، پردہ، ص40، اشاعت جون 2015ء۔
9- ماہنامہ ترجمان القرآن، مئی 2004ء، ادارہ ترجمان القرآن، مدیر خورشید احمد۔
10- مودودیؒ، سید ابو الاعلیٰ، قوموں کے عروج و زوال پر علمی تحقیقات کے اثرات، ص63، ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ، ستمبر 1992ء۔
11- مودودیؒ، سید ابو الاعلیٰ، قوموں کے عروج و زوال پر علمی تحقیقات کے اثرات، ص63، ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ، ستمبر 1992ء۔
12- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، تنقیحات، ص10، اسلامک پبلیکیشنز، ستمبر 2006ء۔
13- ماہنامہ ترجمان القرآن، رجب 1353ھ/ اکتوبر 1934ء، ادارہ ترجمان القرآن۔
14- فاروقی، شاہ نواز، تہذیبوں کا تصادم، ص156، ادارہ مطبوعات طلبہ، ستمبر 2012ء۔
15- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، تنقیحات، ص25، اسلامک پبلیکیشنز، ستمبر 2006ء۔
16- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، تنقیحات، ص10، انیسواں ایڈیشن۔

17- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، تنقیحات، ص18، انیسواں ایڈیشن۔
18- ادبیات مودودیؒ، مرتب پروفیسر خورشید احمد، ص40۔
19- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، تنقیحات، ص25، اسلامک پبلیکیشنز، ستمبر2006ء۔
20- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، تنقیحات، ص28، اسلامک پبلیکیشنز، ستمبر2006ء۔
21- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، تنقیحات، ص30 تا31، اسلامک پبلیکیشنز، ستمبر2006ء۔
22- فاروقی، شاہ نواز، تہذیبوں کا تصادم، ص125، ادارہ مطبوعات طلبہ، ستمبر2012ء۔
23- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، تنقیحات، ص12 تا13، انیسواں ایڈیشن۔
24- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے، ص27۔
25- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، جلد دوم، ص36، سورۃ الاعراف، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، 2011ء۔
26- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، تحریک آزادی ہند اور مسلمان، حصہ اول، ص124، اشاعت2005ء۔
27- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، خطبات، ص65، اسلامک پبلیکیشنز، جون2007ء۔
28- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات، ص306، 1995ء۔
29- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، تنقیحات، ص21، اسلامک پبلیکیشنز، ستمبر2006ء۔
30- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، رسائل ومسائل، جلد دوم، ص499۔
31- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات، ص64، 1995ء۔
32- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، تفہیمات، جلد اول، ص50 تا51۔
33- مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، مسئلہ قومیت، ص56، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، دسمبر1990ء۔

ماحولیاتی آلودگی اور ہماری ذمہ داریاں سیرت النبیﷺ کی روشنی میں

☆ حافظ محمد سہیل شفیق

تمہید:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کیا اور اس کائنات کو اس کے لیے مسخر کر دیا۔ قرآن اس کائنات کو خالق حقیقی کی پہچان کا ذریعہ بتاتا ہے۔ جس کے ذریعے ہمیں اس کی بے شمار صفات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ نباتات و جمادات نہ صرف انسان کے اس دنیا کے ساتھی ہیں بلکہ وہ آخرت میں بھی انعام کی حیثیت سے ان کا ذکر کرتا ہے۔(1)

اللہ تعالیٰ تخلیق ارض وسما کا بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ج وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ج وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ ج وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ۔(2)

’’اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے مینہ برسایا پھر اس سے تمہارے کھانے کے لیے پھل پیدا کیے اور کشتیوں اور جہازوں کو تمہارے زیر فرمان کیا، تاکہ دریا اور سمندر میں اس کے حکم سے چلیں اور نہروں کو بھی تمہارے زیر فرمان کیا۔‘‘

اسی طرح دوسرے مقام پر فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ وَ الْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ط وَ یُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔(3)

☆ ڈاکٹر، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ جتنی چیزیں زمین میں ہیں (سب) اللہ نے تمہارے زیرِ فرمان کر رکھی ہیں۔ اور کشتیاں (بھی) جو اسی کے حکم سے دریا میں چلتی ہیں۔ اور وہ آسمان کو تھامے رہتا ہے کہ زمین پر (نہ) گر پڑے مگر اس کے حکم سے۔ بے شک اللہ لوگوں پر نہایت شفقت کرنے والا مہربان ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو ایک خاص توازن کو ساتھ تخلیق فرمایا ہے۔ یہی توازن اس کائنات کا حسن بھی ہے اور اس کی بقا کا ضامن بھی۔ قرآن کریم اس جانب توجہ دلاتے ہوئے فرماتا ہے:

صُنۡعَ اللّٰهِ الَّذِیۡۤ اَتۡقَنَ کُلَّ شَیۡءٍ ط اِنَّهٗ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَفۡعَلُوۡنَ۔(4)

''یہ اللہ کی صفت ہے جس نے ہر چیز کو مضبوطی سے بنایا ہے۔ بے شک وہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے۔''

وَخَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِیۡرًا۔(5)

''اور اُسی نے ہر شے کو پیدا کیا اور پھر اس کے لیے ایک اندازہ مقررہ کیا۔''

عصرِ حاضر میں ماحولیات کو ایک سائنس اور علم کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ ماحولیات کا مضمون ماحولی تبدیلیوں، ان کے انسانی صحت پر اثرات اور ماحولی تحفظات کے طریقوں سے بحث کرتا ہے۔ ماحولیات کا دائرۂ عمل جدید زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں ماحولیات کا تحفظ بین الاقوامی سطح پر بھی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔

ماحولیاتی آلودگی:

زمین، جنگل، پہاڑ، دریا، صحرا، مختلف النوع جاندار جیسے انسان، پرندے اور حشرات الارض یہ سب ماحولیات کے لازمی اجزا ہیں اور یہ سب اپنی فطری زندگی میں ایک دوسرے کے لئے ضروری ہیں۔ اسی طرح جانداروں اور بے جان چیزوں، موسم، آب و ہوا اور قدرتی وسائل کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور اسی سے انسانی زندگی کی بقا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں ان میں ایک اہم ترین نعمت اس کے ماحول کا اس کے موافق ہونا بھی ہے۔ لیکن اب انسان نے فطرت (Nature) میں مداخلت کر کے اس نظام کو درہم برہم کر دیا ہے، جس کی وجہ سے وہ فضائی، آبی، زمینی، صوتی آلودگیوں اور جانوروں کی بقا اور تحفظ کے مسائل سے دوچار ہے۔

فضا میں انسان اور ماحول کے لئے مضر مادوں کی بھاری تعداد کی موجودگی کے باعث ہوا کے قدرتی اجزائے ترکیبی بگاڑ کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں اور پانی میں بھی ناپسندیدہ اشیاء کی بڑی مقدار جیسے ٹھوس ذرات، حل شدہ نمکیات، صنعتی ناکارہ اشیاء،

گرد وغبار اور حیاتیاتی اشیاء کی موجودگی کے باعث پانی آلودہ ہوکر متعدد بیماریوں کے پھیلنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔اسی طرح سمندر کے اندر پوشیدہ معاشی دولت جیسے تیل، سیپی، مونگا، مچھلی وغیرہ مسلسل بڑے پیمانے پر نکالنے سے سمندروں کا قدرتی توازن تیزی سے بگڑ رہا ہے اور ساحل سمندر پر قائم شہروں سے انسانی وصنعتی فضلہ، کچرا اور گندگی کو سمندر میں بہانے کی وجہ سے وہ آلودہ ہوتے جارہے ہیں۔آلودہ پانی کے باعث سبزیوں، پھلوں، غذائی اجناس اور جانوروں کے گوشت سے بھی بیماریاں پیدا ہورہی ہیں جس کی وجہ کارخانوں کے آلودہ پانی سے کھیتوں کو سیراب کیا جانا ہے۔فیکٹریوں اور کارخانوں میں پانی کی صفائی اور انہیں دوبارہ قابل استعمال بنانے کا کوئی بندوبست نہیں ہے وہ آلودہ پانی کھیتوں میں جاتا ہے یا دریا نہروں میں بہا دیا جاتا ہے جس سے صاف پانی بھی آلودہ ہورہا ہے، اس سے طرح طرح کی بیماریاں جنم لے رہی ہیں اور وبائی امراض پھیل رہے ہیں۔دنیا کے بڑے اور گھمبیر مسائل میں پینے کے صاف پانی کی کمی ایک بڑا مسئلہ بنتا جارہا ہے۔

زمین بھی اپنی طبعی، حیاتیاتی اور کیمیاوی ترکیب میں تبدیلی سے دوچار ہے، نیز بے ہنگم اور غیر ضروری آواز کی وجہ سے صوتی آلودگی پیدا ہوگئی ہے، جس سے انسانی صحت پر مضر اثرات مرتب ہورہے ہیں۔سڑکوں پر ٹریفک کا شور اور بے ہنگم آوازیں ہماری سماعت کو متاثر کررہی ہیں۔صوتی آلودگی سے طبیعتوں میں چڑچڑاپن، سردرد، تھکاوٹ، بہرے پن اور ذہنی دباؤ کے مسائل جنم لے رہے ہیں۔

ماہرین ماحولیات کا کہنا ہے کہ اگر ماحولیاتی آلودگی صرف قدرتی عوامل کا نتیجہ ہوتو اس کا سدباب بھی قدرتی طور پر ہوتا رہتا ہے۔انسان کے قدموں کے نیچے جو زمین بچھی ہوئی ہے اس میں خالقِ ارض وسما نے آلودگی کو جذب کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھی ہے۔اسی طرح ہرے بھرے درخت، یہ فضا اور دنیا میں پھیلے ہوئے سمندر بھی آلودگی کو جذب کرنے کی قدرتی صلاحیت سے مالا مال ہیں۔مگر قدرتی ماحول میں جو بگاڑ ہم زمین، فضا اور پانی میں زہریلے مادے خطرناک کیمیاوی اجزاء شامل کرکے پیدا کررہے ہیں، اس کا سدِ باب قدرتی طور پر ممکن نہیں ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ لالچ، حرص وہوس اور زیادہ منافع کمانے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی بے تحاشہ دوڑ میں کرہ ارض کا قدرتی حسن متاثر ہورہا ہے اور بے شمار حیاتیات تباہ ہورہی ہیں۔کرہ ارض پر موجود حیاتیات کو قدرتی ماحول میں بتدریج تبدیلی سے بڑے خطرات کا سامنا ہے۔انسانی کوتاہیاں اور خودغرضی فطرت کے نظام کو متاثر کررہی ہیں۔ماحولیاتی آلودگی کا مسئلہ اب مقامی یا ملکی مسئلہ نہیں رہا بلکہ پوری انسانیت کا مسئلہ بن چکا ہے۔

آلودگی خواہ کسی بھی قسم کی ہو اس سے انسانی صحت اور قدرتی ماحول بہت بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ ماہرین ماحولیات کا خیال ہے کہ ہمارے پاس آلودگی کے مسئلے پر قابو پانے کے لیے کچھ زیادہ مہلت نہیں ہے۔ اگر موثر اقدامات نہ کیے گئے اور آلودگی پر قابو نہ پایا جاسکا تو خدانخواستہ آئندہ دو صدیوں میں کرہ ارض پر ہر قسم کی انسانی، حیوانی اور نباتاتی زندگی ختم ہوسکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ جو قدرتی ماحول کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں، نہ انھوں نے اپنے خالق کو پہچانا اور نہ اپنے معبود کی بندگی اختیار کی۔ فطری ماحول کی اہمیت وافادیت قرآن وحدیث میں جابجا بیان کی گئی ہے۔ قرآن میں احکامات والی آیات کی نسبت ان آیات کی تعداد زیادہ ہے جن میں فطرت اور فطری مظاہر کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس لیے فطرت کا مطالعہ اہل ایمان پر ضروری قرار پاتا ہے۔ اسی طرح سیرتِ رسول واحادیث طیبہ سے بھی ہمیں ماحولیات کے گوناگوں پہلوؤں پر رہنمائی بھی ملتی ہے۔ بالخصوص قدرتی وسائل کا استعمال اور ان کا تحفظ، وسائل کا مناسب استعمال، ان میں اسراف سے پرہیز وغیرہ۔

سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں ہماری ذمہ داریاں:

آبی آلودگی:

پانی ہر انسان کی بنیادی ضرورت پانی ہے۔ پانی اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت ہے کہ ہم اس ایک نعمت ہی کا شکر ادا کرنا چاہیں تو نہیں کرسکتے۔ خود انسان کے وجود کا 80 فیصد پانی پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (6)

ہم نے ہر چیز کو پانی سے پیدا کیا، کیا پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

پانی کی اسی اہمیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے کرہ ارض پر تین حصّے پانی اور ایک حصہ خشکی رکھا ہے۔ ۹۷ فیصد زمین کا پانی سمندروں کی شکل میں ہے، انسان کے لئے قابل استعمال پینے اور دیگر استعمال کے لئے صرف تین فیصد پانی ہی دستیاب ہے، جس کو ہم تازہ پانی کہتے ہیں۔

قابل استعمال پانی، برفانی تودوں یا عمیق برف کی چادر کی شکل میں قطبین (Poles) پر ہے۔ برفانی پانی عموماً کسی بھی قسم کی آلودگی سے پاک ہوتا ہے، لیکن برفانی پانی کا تناسب صرف ایک فیصد ہے، اور دو فیصد میٹھا اور قابل استعمال پانی،

دریاؤں، ندیوں، نہروں، جھیلوں، تالابوں اور کنوؤں سے حاصل ہوتا ہے۔ صاف پانی کے حصول کے لیے آج دنیا بحرانی کیفیت میں ہے اور یہ امکان ظاہر کیا جارہا ہے کہ اب دنیا میں جنگیں آبی وسائل کے حصول کے لیے ہوا کریں گی۔ اسلام نے پانی کی اہمیت کو بہت عرصہ پہلے قرآن کریم میں بیان فرمادیا تھا۔ ارشاد ربانی ہے:

قُلْ اَرَئَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُکُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْکُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ۔(7)

''کہو! کہ بھلا دیکھو تو اگر تمہارا پانی (جو تم پیتے ہو اور برتتے ہوئے) خشک ہو جائے تو
(اللہ کے سوا) کون ہے جو تمہارے لیے شیریں پانی کا چشمہ بہالائے۔''

رحمتِ عالم ﷺ نے پانی پر اجارہ داری قائم کرنے کو سخت ناپسند فرمایا۔ اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان کے مطابق:
قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تین لوگوں سے کلام نہیں فرمائے گا، ان میں ایک وہ شخص ہے جس نے زائد پانی کو روک لیا۔(8)
ایک اور موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

المسلمون شرکاء فی ثلاث، فی الماء والکلا والنار۔(9)

''تین چیزوں میں تمام مسلمان شریک ہیں، پانی، گھاس اور آگ میں۔''

سیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں دیکھا جائے تو آپ ﷺ نے پانی کے اسراف سے روکتے ہوئے ایک موقع پر عجیب بات فرمائی۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار آپ ﷺ کا ایسے مقام سے گزر ہوا جہاں حضرت سعد رضی اللہ عنہ وضو فرما رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اسراف کیسا؟ انہوں نے عرض کی کہ کیا وضو میں بھی اسراف شمار ہوگا؟ اس پر آپ ﷺ نے یہ قیمتی جملہ رہتی انسانیت کو عطا فرمایا:

نعم وان کنت علی نھر جار۔(10)

''ہاں۔ خواہ تم کسی بہتی نہر کے کنارے وضو کر رہے ہو۔''

آج پانی کی آلودگی سب سے بڑا اور اہم مسئلہ بن چکی ہے۔ پانی کو آلودگی سے بچانے کے لئے اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے بہت واضح اور اہم تعلیمات دی ہیں۔ ان ہی میں سے ایک تعلیم یہ ہے کہ ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کیا جائے۔(11)

اسی طرح پانی کو آلودہ ہونے سے بچانے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"پانی یا دیگر مشروب کے برتن کو ڈھانک کر رکھا جائے۔"(12)

پانی کو آلودگی سے بچانے اور انسان کی سلامتی اور صحت کے تحفظ کی خاطر اللہ کے رسول ﷺ نے ہر اس حسن تدبیر کا حکم دیا ہے جو پانی کو آلودگی سے محفوظ رکھے، چنانچہ آپ ﷺ نے پانی کے برتن میں سانس لینے سے بھی منع فرمایا ہے۔(13)

آلودگی کے باعث وسائل آب اپنی کثرت کے باوجود قلت کا شکار ہوگئے ہیں۔ دنیا کی ایک بڑی آبادی کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں ہے۔ تعلیماتِ نبوی ﷺ پر عمل کرتے ہوئے پانی کو آلودہ ہونے اور ضائع ہونے سے بچا کر ہی قلتِ آب کے مسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سیوریج کے پانی کو ضائع ہونے سے بچا کر آبی آلودگی میں کمی لائی جاسکتی ہے۔ نکاسی آب کا ایک اچھا نظام بھی متعدد بیماریوں اور جراثیم سے بچنے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

فضائی آلودگی:

فضاء میں پائی جانے والی مختلف قسم کی گیسیں، ہواؤں کا نرم وخرام اور کبھی آندھی طوفان کی شکل میں چلنا، موسموں کی حسب معمول تبدیلی، درجہ حرارت کا اتار چڑھاو، بارشوں کا برسنا اور بادلوں کی گردش، یہ سب کچھ ایسا متوازن نظام ہے، جو انسانی حیات اور جانداروں کی زندگی کے لیے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔(14)

فضائی آلودگی کے اسباب پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ لکڑی، کوئلہ، تیل اور گیس کا بے جا اور غلط استعمال، صنعتی کارخانوں اور اسلحہ ساز فیکٹریوں کے فضلات، ہتھیاروں کا بے محابا استعمال، ٹریفک کی بہتات، جنگلات کی کٹائی، زہریلی گیسوں اور تابکاری شعاعوں کا اخراج اور سگریٹ نوشی اس کی بڑی وجہ ہیں۔

فضائی آلودگی کے سدباب کے سلسلے میں بھی تعلیماتِ نبوی ﷺ بالکل واضح ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ایسے تمام کاموں سے روکا جو فضائی آلودگی کا سبب بنتے ہیں۔ ارشادِ نبوی ہے:"

رات کو سوتے وقت چراغ گل کردو۔" (15)

اس لیے کہ انسانی جان کے لیے خطرے کا باعث ہے، نیز دھواں، دم گھٹنے اور فضائی آلودگی کا قوی سبب ہے۔ موٹر گاڑیوں، الیکٹرک مشینوں اور صنعتی کارخانوں سے نکلنے والا دھواں اور گیس بھی اسی ضمن میں آتی ہیں، لہٰذا آپ ﷺ کی تعلیم ان تمام ذرائع پر مشتمل ہے جو دھواں اور زہریلی گیسوں کے اخراج کا سبب بنتے ہیں۔

غور کیا جائے تو مردوں کو دفن کرنے کا اسلامی طریقہ بھی فضائی اور آبی آلودگی کے اسباب و ذرائع کے لیے ایک قدغن ہے۔

صوتی آلودگی:

صوتی آلودگی بھی ماحولیاتی آلودگی کی ایک قسم ہے یعنی آوازوں کا ضرورت سے زیادہ بڑھ جانا، جس کے باعث طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ کارخانوں اور فیکٹریوں سے بلند ہونے والی آوازیں، ٹریفک کی گھن گھرج، گانے باجے سے اٹھنے والا شور، فضاء کی بلندیوں پر اڑنے والے جہازوں کی نیند اڑا دینے والی پُرشور آوازیں، صوتی آلودگی کے اسباب اور ذہنی دباؤ کا ایک بڑا سبب ہیں۔

موجودہ دور میں صوتی آلودگی بھی ماحولیات کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ اسلام نے اس بارے میں بھی اعتدال کی تعلیم دی ہے اور موقع و محل کو نظر انداز کرنے اور ضرورت سے زیادہ آواز نکالنے کی مذمت بیان کی ہے۔

جیسا کہ حضرت لقمانؑ کی نصیحت نقل کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ۔(16)

''اور اپنی آواز کو پست رکھ، بے شک سب سے زیادہ مکروہ آواز گدھے کی آواز ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاضرورت آواز کو بلند کرنا کہ طبع سلیم کو ناگوار گزرے اور سننے والا وحشت محسوس کرنے لگے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت ناپسندیدہ ہے۔

اسلام زندگی کے تمام معاملات میں توازن اور اعتدال کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ عبادات میں بھی غیر معتدل رویے کو پسند نہیں کرتا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے بلند آواز سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کو بھی پسند نہیں فرمایا۔ ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ ہم ایک سفر میں تھے۔ ایک آدمی نے بلند آواز میں پکارا: لا الہ الا اللہ واللہ اکبر۔ تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو۔(17)

اگر ہم اس بارے میں تعلیماتِ نبوی ﷺ کو پیش نظر رکھیں تو یقیناً صوتی آلودگی کے مسئلے پر بھی قابو پا سکتے ہیں۔

زمینی آلودگی:

اکثر جان دار بشمول انسان اپنی غذا زمین سے حاصل کرتے ہیں۔ بہت سے جانور سبزی خور ہوتے ہیں۔ ان سبزی خور جانوروں کو انسان اور دیگر جاندار کھاتے ہیں۔ اس طرح درختوں اور پودوں کے ذریعے خوراک کی ترسیل کا پورا نظام کام